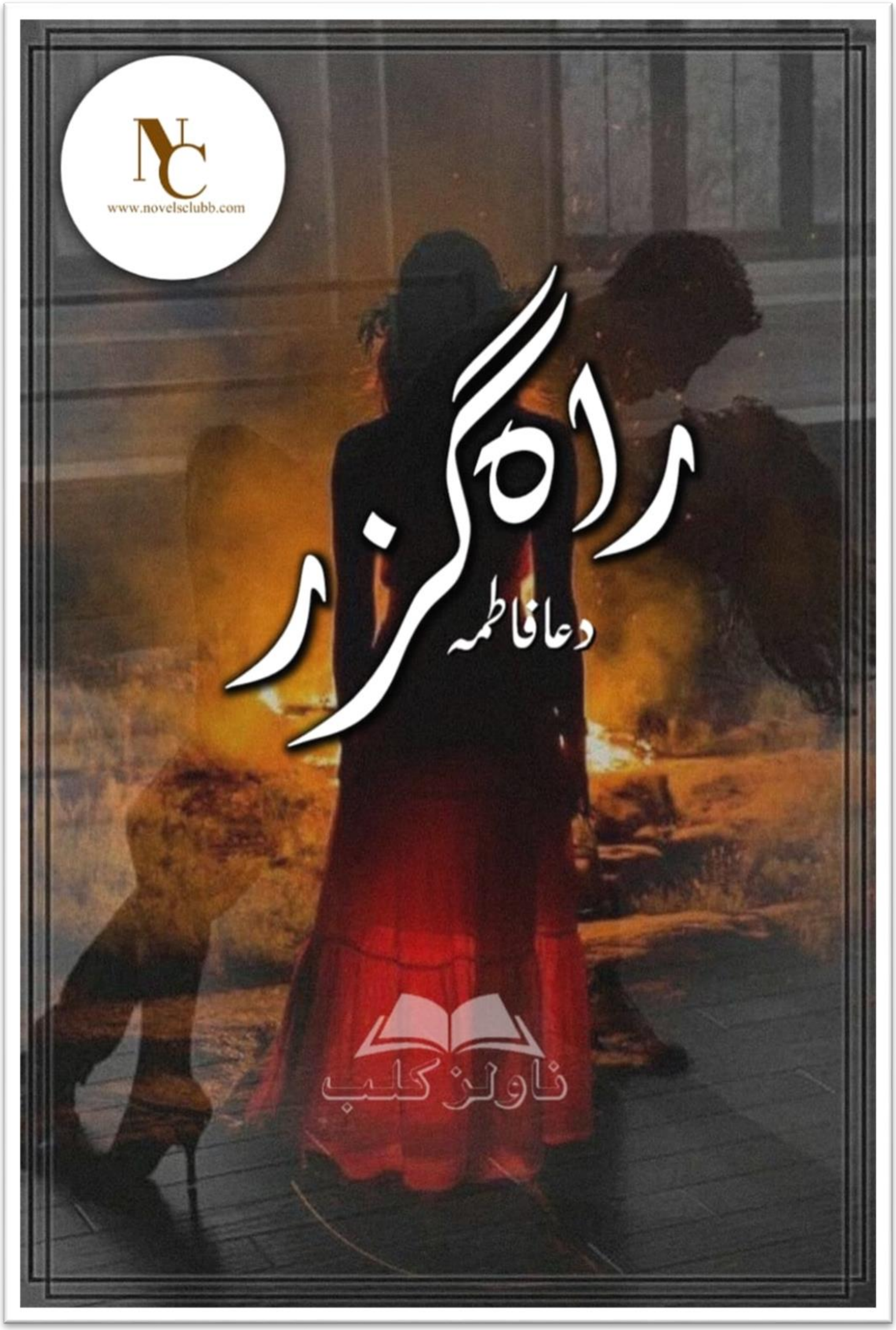

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

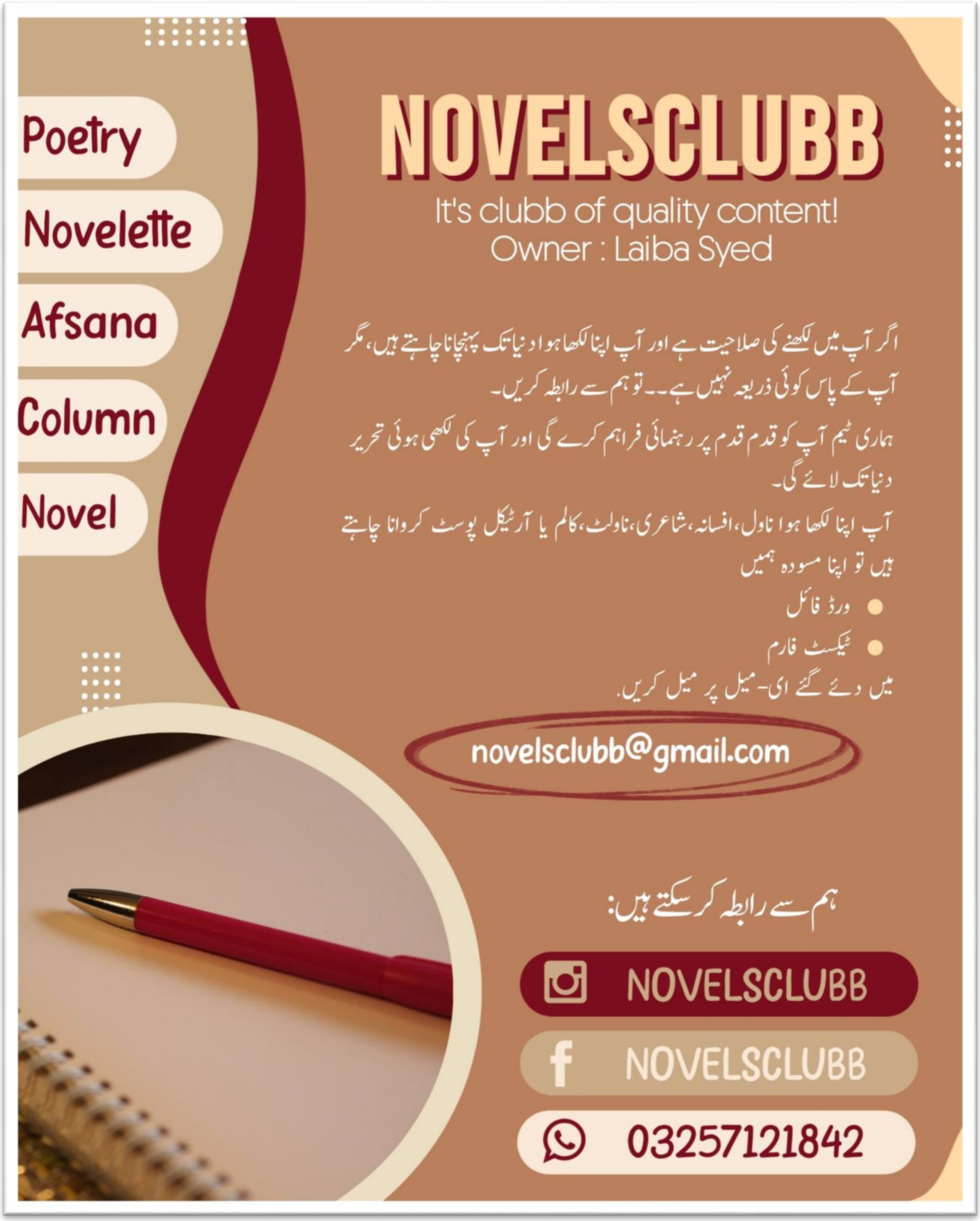
Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دیئے گئے ای-میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

راہ گزر

از قلم

دعا فاطمہ

www.novelsclubb.com

انتساب

میری زندگی اور اس کی تلخیوں کے نام۔۔۔زندگی کے حقیقی چہرے کے نام۔۔۔زندگی کی تلخ گہرائیوں کے نام!

www.novelsclubb.com

پیش لفظ

یہ کہانی ہے ایمان زاویار کی۔۔۔اس ایمان زاویار کی جو زندگی کے شروع ہوتے ہی اس کی تلخیوں سے جا ملتی ہے۔اس ایمان زایار کی جو زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ایمان کھو بیٹھتی ہے۔اس ایمان زاویار کی جس کی زندگی کی تلخیاں ہی اسے اس کا امیان واپس لوٹاتی ہیں۔اس ایمان زاویار کی جو صرف اپنے آپ کے ساتھ اس دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔

کہانی ہے زندگی کی۔اس زندگی کی جو اپنا خوبصورت نقاب اتار پھینکتی ہے۔اس زندگی کی جس کی بدصورت حقیقت سامنے آتی ہے۔اس زندگی کی جو انسان کو چاروں اور سے گھیرے اس کو تنہا کر ڈالتی ہے۔

کہانی ہے راتوں کو رونے والوں کی، کہانی ہے سسکنے والوں کی، کہانی ہے اکیلے رہ جانے والوں کی۔۔۔

www.novelsclubb.com

کہانی ہے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّانے والے رمیص جہانزیب کی۔۔۔

کہانی ہے دور پردیس میں کہیں کھو جانے والے ارتضی مراد کی۔۔۔

داستان ہے غزل ارشد کی۔۔۔داستان ہے ایمان زاویار کی۔۔۔

اس کہانی کی سب سے ڈیزروِنگ لکھاری میری نانی ہیں جنھوں نے میری تھیم سن کر ایک ہی بار میں مجھے میری کہانی کا نام بتا کر مجھے میری ناول کا پلاٹ، کلائمیکس اور اختتام تھما دیا۔میری کہانی کو ایک نیا رخ بخشا۔ارشد شریف شہید کی سوانح عمری کچھ الگ لفظوں میں بیان کر کے میں نے ایک اور تھیم کو اس ناول کا حصّہ بنایا ہے۔سب سے آخر میں میری پوری کوشش ہے کہ میں اپنے ذہن میں قائم ہوئے اسباق کو با آسانی اس ناول کے ذریعے آپ تک پہنچا سکوں۔

والسلام

دعا فاطمہ

www.novelsclubb.com

راہ گزر

باب2:

کہانی ایمان زاویار کی

کہانی غزل رمیص کی

ہے یہ داستاں رمیص جہانزیب کی

اور ارتضی مراد کی

جب ظلم حد سے بڑھ جائے

جب روح زخمی ہو جائے

جب دل شکست کھا جائے

جب روح اشک بار ہو جائے

جب اذیت جسم میں اتر جائے

جب خواہش پچھتاوا بن جائے

جب ظلم کے آگے ایک جواں

شمشیر لے کے نکل آئے

جب جہاں کے یہ حیواں

ایک گھر اجاڑ کر، ایک دل مار کر

ایک روح کو پیروں تلے روند کر

آگے بڑھ جائیں۔۔۔

جب ایک اپنا ساتھ چھوڑ جائے

جب کوئی ہم سے یہ کہہ جائے

کیوں ہوتے ہو اتنے اداس؟

کیوں ہوتے ہو اتنے اشک بار؟

تو بھی ہم یہ کہہ نہ پائیں

کہ تم ہی تو تھے جو تھے ظالم

تم ہی تو تھے جو تھے مجرم۔

(از خود)

کراچی کے آسمان پر سورج خوب آب وتاب سے چمکتا اپنی پر حدّت روشنی ہر سو بکھیر رہا تھا۔ نیلے آسمان پہ کہیں کہیں سفید روئی کے گالوں کی مانند بہتے بادل چمکتے محسوس ہو رہے تھے۔ تیز ہواؤں نے چل کر سورج کی حدّت کو کافی حد تک کم کر رکھا تھا۔

ایسے میں ایک بڑی سفید رنگ کی شیشے کی عمارت کی ایک راہداری میں کوئی شخص آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ سیاہ پینٹ کوٹ پہنے، سیاہ بالوں کو سلیقے سے جیل سے پیچھے کو سیٹ کیے، وہ تقریباً

چالیس سال تک کا لگتا تھا۔ سیاہ زیرک آنکھیں آس پاس کا معائنہ بخوبی کر رہی تھیں۔ متوازن چال چلتا، اگلے ہی پل وہ رک کر مڑا تھا اور سامنے موجود کمرے کا سفید رنگ کا دروازہ ہولے سے کھٹکھٹایا تھا۔

"کم ان۔"، اندر سے آواز ابھری تو اس نے دھیرے سے دروازے کا ناب گھما کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرہ اندر سے کافی وسیع اور کھلا سا تھا اور اے سی کی ٹھنڈک سے سرد پڑ رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک شیشے کی میز اور کرسی رکھی تھی جبکہ میز کے داہنے طرف دیوار کے ساتھ ایک ڈبل صوفہ رکھا تھا۔ پورا کمرہ گویا سفید رنگ میں نہایا ہوا لگتا تھا۔

اندر ایک پچپن چھپن سال تک کا آدمی اضطراب اور بے چینی سے ہاتھوں کی انگلیاں مڑوڑتا، ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ سفید ڈریس شرٹ اور سیاہ پینٹ پہنے، وہ بھوری آنکھوں اور بھورے بالوں والا شخص تھا۔ نووارد کو اندر داخل ہوتے دیکھ وہ فوراً سے اس کی جانب بڑھا تھا۔

"فیضان، دروازہ ٹائٹ سے بند کر کے آؤ۔"، اس نے کہا تو نووارد سر ہلاتا مڑا اور جا کر دروازہ صحیح

سے بند کیا، پھر مڑ کر ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد آس پاس نگاہ دوڑائی۔

"تم نے تو کہا تھا کہ کوئی میٹنگ ہے۔۔۔ باقی سب کہاں ہیں؟"، فیضان نے اچھنبے سے پوچھتے ہوئے قدم صوفے کی جانب بڑھائے تو وہ بھی اس کے پاس ہی آگیا۔

"جھوٹ کہا تھا میں نے۔ آپریٹر سن رہا تھا ناں۔"، اس نے کہا تو فیضان کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ نا سمجھی بھی ساتھ ہی عود کر آئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"سارے مطلب چھوڑو، فیضان۔۔۔ میں بہت بری طرح سے پھنس گیا ہوں۔ کچھ کرو۔"، اس نے کہا تو فیضان سیدھا ہو بیٹھا اور کچھ حیرت سے اسے دیکھتا قریب ہوا۔

"کیا ہوا ہے؟ بولو بھی۔"، ایک تو اس کی عجیب و غریب سی پہلیاں بوجھانے کی عادت۔ اف! وہ اکتایا تو اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"سی ایم کو پتا چل گیا ہے کہ وہ میں ہی تھا جس نے رمیص کے لیے مواد جمع کیا تھا۔۔۔ اور اب وہ

www.novelsclubb.com

میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔"، اس نے کہا تو فیضان نے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا۔

"ہاں تو؟"، وہ حیران ہو کر فیضان کے قریب آ بیٹھا تھا۔

"کیا مطلب، فیضان؟ تم نے دیکھا نہیں کہ کیسے انہوں نے رمیص کو قبر تک پہنچا دیا ہے۔ اب وہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں بہت بری طرح سے پھنس گیا ہوں۔ میرے بچے چھوٹے ہیں۔ بیوی ہے ایک۔ ماں ہے۔ مجھے ان سب کی فکر ہے۔ اگر انہوں نے مجھے کچھ کر دیا تو ان سب کا کیا ہو گا؟"، وہ پریشانی سے بولا تو فیضان حیرت سے اسے دیکھتا کچھ سیدھا ہو کر اس کے قریب ہوا۔

"کیا مطلب ہے، اصغر؟ تم سرینڈر کر رہے ہو؟"، وہ شدید بے یقین تھا۔ اس سب کا آئیڈیا دینے والا اور ان کو ہر لحاظ سے گائیڈ کرنے والا اصغر ہی تو تھا، اور اب جب اس نے بازی اپنی جانب پلٹتے دیکھی تو فوراً ڈر کر بیٹھ گیا۔ یعنی جب تک وکٹم رمیص اور فیضان بنتے تو ٹھیک تھا۔ جب بات اپنے پر آئی تو وہ سرینڈر کر رہا تھا۔ فیضان سخت بے یقین تھا۔

"اصغر، تم میں ذرہ برابر بھی شرم اور غیرت ہے؟ تم کیسے اب پیچھے ہٹ سکتے ہو؟"، وہ غرّایا تھا۔ اصغر نے اس کی بات سن کر سر نفی میں ہلایا تھا۔

"میرے پاس اور کوئی آپشن نہیں ہے، فیض۔ سوری۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"، وہ شکست خوردگی سے قطعی لہجے میں کہہ رہا تھا، یوں جیسے وہ پہلے ہی سب طے کر چکا ہو۔ فیضان کی مٹھیاں خود بخود ہی بھینچتی چلی گئی تھیں۔ اگلے ہی پل وہ زور سے بوٹ پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تو کیا رمیص مرنا چاہتا تھا، ہاں؟ مرنا کوئی نہیں چاہتا۔۔۔ ہاں لیکن اللہ کے لیے مرنا سب چاہتے ہیں۔۔۔ مگر تم، مردود۔۔۔ تم شاید ان "سب" میں شامل نہیں ہو۔۔۔"، وہ دھاڑا تھا۔ اصغر پر اس کی دھاڑ، اس کی ملائمت کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ یونہی ڈھیٹ بنا بیٹھا اسے خالی نظروں سے تک رہا تھا۔

"تمہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ رمیص نے کس مقصد کے لیے اپنی جان دی ہے؟ ذرا سا بھی کوئی گلٹ نہیں ہو رہا تمہیں یہ سب کرتے ہوئے؟"

"نہیں۔"، فیضان نے اس کے صاف جواب پہ آنکھیں اور مٹھیاں ضبط سے بند کر کے کھولی تھیں۔ لب بھینچ کر وہ اس کے قریب آیا تھا اور جھکا تھا۔

"تم جانتے ہو نا کہ تم نے کچھ بھی کہا تو وہ مجھ تک بھی آ جائیں گے۔۔۔ اور پھر اس وجہ سے،

صرف تم ہی نہیں، میں بھی اس مقصد کو پورا نہیں کر پاؤں گا؟ تم تو اپنی مرضی سے اس مقصد سے پیچھے ہٹے ہو۔۔۔مجھے زبردستی ہٹایا جائے گا۔۔۔تم میں ذرا سا بھی اللہ کا خوف ہے یہ نہیں؟"، اس کی آواز میں بے یقینی، دکھ اور اذیت ایک ساتھ ہلکورے لے رہی تھی۔ چہرے پہ افسوس کے تاثرات تھے۔ اصغر نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کر کے اسے دیکھا تھا۔

"آئی ڈونٹ نو اینی تھنگ۔۔۔آئی ایم سوری۔"

اس کے کہنے پر فیضان نے مڑ کر ایک ہی جست میں اس کی میز تک جا کر بپھر کر میز کا سارا سامان زمین پر پھینکا تھا۔ اصغر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ فیضان مشتعل تھا، سخت مشتعل!

"جہنم میں جاؤ تم، اصغر۔۔۔دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں جا کر پھینکا جائے گا تمہیں، انشاءاللہ۔"، وہ ضبط سے سرخ پڑتی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑھ کر کہتا، اگلے ہی پل لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ اپنے پیچھے دروازہ بہت زور سے بیچ کر وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ پیچھے اصغر نے بہت ہی نڈھال سے انداز میں سر صوفے کی پشت پر گرایا تھا۔ وہ ڈرپوک

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

تھا۔ وہ ہار مان لینے والا تھا۔ وہ رمیص جہانزیب کی طرح بہادر تو نہیں تھا۔ بالکل بھی نہیں!

پارکنگ لاٹ میں کھڑی سفید رنگ کی گاڑی کا دروازہ کھول کر ابھی وہ اندر بیٹھنے ہی والا تھا کہ ڈیش بورڈ پر رکھا اس کا موبائل چنگھاڑا تھا۔ جلدی سے اندر بیٹھ کر اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو سامنے چمکتے الفاظ پڑھتے ہی اس نے فوراً سبز چمکتے بٹن پر انگلی سے کلک کیا اور فون کان سے لگایا۔ ساتھ ہی بازو آگے بڑھا کر دروازہ بند کیا تھا۔

"السلام علیکم بھابھی۔"، اس کے لہجے سے کچھ دیر پہلے والے اشتعال اور غصّے کی غرّاہٹ اب نہیں جھلکتی تھی۔ وہ یقیناً بہت ضبط کر رہا تھا۔ سپید چہرہ ضبط سے سرخ پڑ رہا تھا۔ آنکھیں دہکتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"وعلیکم السلام بھائی۔۔۔ آپ نے اور عالم صاحب نے کیس ریڈی کر لیا مل کر؟"، اگلی جانب سے غزل نے بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں دھیرے سے کہا تھا۔

"جی بھابھی۔ ایوری تھنگ از ڈن۔ انشاءاللہ بہت جلد کیس شروع ہو جائے گا۔"، اس نے ایک گہرا سانس لے کر جواب دیا اور فرنٹ مرر کے پار نظر آتا مصروف سا روڈ دیکھنے لگا جس پر تیز

www.novelsclubb.com

رفتار گاڑیاں چلتی جا رہی تھیں۔ کتنے مصروف تھے نا یہ لوگ۔ کون کس حال میں ہے، کون مرنے کے دہانے پر پہنچا ہوا ہے، انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ یہ عوام پانچ سو روپے لیٹر پٹرول ہونے پر بھی دو دن سوشل میڈیا پر بول کر پھر اسی پانچ سو روپے لیٹر پٹرول کو خریدتی تھی۔ اس عوام سے کیا امید لگانا؟

"تھینک یو سو مچ، فیضان بھائی۔ اگر آپ ساتھ نہ دیتے تو میں تو کچھ کر ہی نہیں پاتی۔ اللہ آپ کو بہت اجر دے گا انشاءاللہ۔"، غزل نے دل سے دعا دی تھی۔ فیضان مسکرایا تھا۔

"یہ میرا فرض تھا، بھابھی۔ رمیص اور میرا مقصد ایک ہے۔ اور اس مقصد میں پیچھے نہیں ہٹا جاتا۔ جو پیچھے ہٹ کر پیٹھ پھیر لے، وہ ہم سے نہیں۔"، نگاہوں کے آگے ایک قابل نفرت چہرہ لہرایا تو اس نے لب بھینچ لیے۔ غزل افسردگی سے مسکرا دی تھی۔

"اللہ آپ کو آپ کے مقصد میں کامیابی دے، بھائی۔ اور میرے شوہر کو بھی اس کی محنت اور اس کے حصّے کا اجر دے۔"، اس کی آنکھوں میں اشکوں کے موتی چمکنے لگے تھے۔ وہ خود کو رونے سے بمشکل روکے ہوئی تھی۔

"آمین۔آئیں گے ہم بھی ایک دو دنوں میں آپ کے ہاں۔خیال رکھئے گا۔"، فیضان نے ہلکا سا مسکرا کر کہا تو وہ سر ہلانے لگی۔

"کیوں نہیں؟ بالکل آیئے گا۔"، وہ مسکرادی تھی۔اس کی ہیزل آنکھوں میں نمی چھلک رہی تھی۔لب نجانے پھر بھی مسکراہٹ میں کیسے ڈھلے ہوئے تھے۔شاید اسے رمیص جہانزیب کی بات کر کے ہی خوشی محسوس ہوا کرتی تھی۔

"اچھا چلیں، اب میں فون رکھتی ہوں۔بھابھی کو میرا سلام کہیے گا۔خدا حافظ۔"، غزل نے کہہ کر فون رکھا تو وہ بھی اگنیشن میں چابی گھما کر گاڑی روڈ پر ڈال گیا۔ذہن میں کئی الجھنیں، کئی پریشانیاں بیک وقت چل رہی تھیں۔ساری پریشانیاں گڈمڈ ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

حیدر آباد میں موجود زاویار احمد صاحب کے گھر کے صحن میں اس وقت چند لوگ بیٹھے تھے۔

چارپائی پر ایک شان سے بیٹھے زاویار صاحب اپنے سامنے بیٹھے اپنے بڑے بھائی کی بات سن رہے تھے۔چہرے پہ وہی سنجیدگی رقم تھی جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔سفید رنگ کے بے داغ

شلوار قمیض پہنے، وہ ویسے ہی رعبدار لگ رہے تھے۔

"زاویار۔۔۔میں نے تم سے تین بار ایمان کا ہاتھ مانگا اپنے گل شیر کے لیے۔۔۔لیکن تم نے منع کر دیا یہ کہہ کے کہ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔اور اب تم نے اس کا رشتہ طے کر دیا؟"، جلال احمد خان بڑے دبدبے اور سنجیدگی سے شکوہ کر رہے تھے۔

"لالہ، آپ تو جانتے ہیں کہ اس کے رشتے کتنی مشکلوں سے آتے ہیں۔رشتہ مناسب لگا تو میں نے ایمان سے پوچھے بغیر ہی ہاں کر دی۔"، اسی سنجیدگی سے کہتے زاویار صاحب نے نگاہ پھیر کر اندرونی دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ایمان کو دیکھا تھا، جو سادہ سے شلوار قمیض پہنے، سر پر سلیقے سے دوپٹہ لیے ہوئے تھی۔اس کی آنکھوں میں موجود واضح سی شکایت کو دیکھ کر بھی زاویار صاحب نے نظر انداز کیا تھا۔

"ہاں مگر اتنی جلدی میں شادی کیوں کر رہے ہو؟" جلال کی بات پر زاویار نے نگاہیں پھیر کر پھر سے انہیں دیکھا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس فرض سے جتنی جلدی ہو سکے، فارغ ہو جاؤں۔۔۔تاکہ پھر فاطمہ کی

بھی باری آئے۔ آپ فاطمہ کا رشتہ کر دیں نا گل شیر سے۔ دونوں کی جوڑی بہت اچھی لگے گی۔"، رضیہ بیگم نے زاویار صاحب کی بات پر انہیں نگاہیں پھیر کر دیکھا تھا۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ ان کے ذہن میں کیا خرافات چل رہی ہیں۔ ایک افسردہ سا سانس خارج کر کے انہوں نے پھر سے نگاہیں جلال صاحب کی جانب پھیری تھیں۔

"مگر گل شیر تو ایمان کو پسند کرتا ہے ناں۔ فاطمہ سے کیسے رشتہ کر دیں؟"، جلال صاحب نے نخوت اور سختی سے کہا تو زاویار صاحب کے لب بھینچے۔ ان کے مطابق تو جتنی خوبصورت فاطمہ تھی، اسے کوئی بھی باآسانی پسند کر سکتا تھا۔ مگر یہ تو انہوں نے پہلی بار ہی کسی کے منہ سے سنا تھا کہ اسے فاطمہ سے زیادہ ایمان پسند ہے۔

www.novelsclubb.com

"اچھا آپ سب باتیں چھوڑیں۔ نکاح میں ضرور آیئے گا۔ مجھے اچھا لگے گا۔"، زاویار صاحب نے بمشکل مسکرا کر کہا تو جلال صاحب نے سر جھٹک کر دور کھڑی ایمان کو دیکھا۔ کہیں نا کہیں وہ بھی جانتے تھے کہ ایمان عامر سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر شاید وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ گل شیر سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی!

☆☆☆

ایمان کی شادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ بازاروں کے چکر۔۔۔ کبھی میچنگ جیولری تو کبھی جوتے۔۔۔ کبھی کیا تو کبھی کیا۔ زاویار احمد صاحب کے گھرانے کی یہ پہلی شادی ہی تھی۔۔۔ یوں تو انہیں کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر فاطمہ اور شانزے کے شوق، مہندیاں لینا، لگوانا، کپڑوں کی میچنگ کے جوتے اور جیولری، پارلرز کے روز روز کے چکر۔

ایسے میں ابھی صرف دو ہی دن باقی تھے ایمان کی نکاح اور رخصتی میں۔ وہ سن سی پورے پورے دن بیٹھی رہ جاتی، نگاہیں پھیر پھیر کر لوگوں کو، گھر والوں کو، بہن بھابھی کو تیاریاں کرتے ہوئے دیکھتی تو چیخ چیخ کر رونے کا دل چاہتا، مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ اسے ان دیکھی زنجیروں میں قید ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں پلنگ پہ بیٹھی بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھی۔ نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پہ ساکت تھیں۔ چہرہ بے تاثر تھا۔ آنکھوں میں گہری ویرانی چھائی تھی۔ لب

سلے ہوئے تھے۔آنکھوں کے گرد بڑے سیاہ حلقے تھے۔چہرہ زرد سا، پژمردہ لگتا تھا۔

زرد رنگ کے سادہ شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ ہی دوپٹہ شانے پہ ایک طرف کو ڈالے، وہ ہاتھ پہلو میں رکھے ہوئے تھی، جبھی دروازہ ہولے سے کھٹکھٹا کر کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ایمان نے بے تاثر نگاہیں پھیر کر انہیں دیکھا تھا، جو نارنجی رنگ کے سادہ شلوار قمیض میں ملبوس، دوپٹہ صحیح سے شانوں پہ پھیلائے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتیں، اس تک آرہی تھیں۔

پلنگ تک پہنچ کر وہ آہستہ سے اس کے برابر میں ہی ٹک کر بیٹھ گئیں تو وہ سیدھی ہو بیٹھی۔چہرہ اب بھی ویسا ہی بے تاثر سا ہو رہا تھا۔رضیہ نے ایک گہرا نم سانس فضا کے سپرد کر کے اسے دیکھا تھا۔آنکھیں نم تھیں۔اور سرخ بھی۔بوڑھے چہرے پہ تھکاوٹ صاف دکھتی تھی۔ان کے چہرے پہ کہیں کہیں اب جھریاں بھی نظر آتی تھیں۔

کمرے کی خاموش پڑی فضا میں گھریں وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تک رہی تھیں۔ سیاہ اور بھوری آنکھیں آپس میں ٹکرا کر خاموشی میں ایک ارتعاش سا پیدا کر رہی تھیں۔وہ اس

کی سیاہ آنکھوں میں واضح چیخ و پکار دیکھ بھی سکتی تھیں، اور سن بھی سکتی تھیں۔ یوں جیسے اس کے اندر ایک گہرا شور سا برپا ہو، جسے چھپانے کے لیے وہ ویرانی کو ادھار لیے ہوئی تھی۔

رضیہ نے نم آنکھیں پھیر کر سامنے دیوار پہ موجود فوٹو فریم کو دیکھا تھا۔ اس میں دو سالہ ایمان کی تصویر آویزاں تھی۔ گول مٹول سی ہنستی ہوئی ایمان کی۔ وہ شاید صرف تبھی دل سے ہنسا کرتی تھی، اب تو وہ محض دکھاوا کرتی تھی۔

"میں پندرہ سال کی تھی جب زاویار صاحب کا رشتہ آیا تھا میرے لیے۔"، خاموشی کو چیرتی یہ آواز رضیہ بیگم کی تھی۔ ان کی بھوری آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر گرنے لگے تھے۔ آنکھوں کے پپوٹے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ ایمان چپ چاپ انہیں یونہی دیکھے گئی تھی۔

"میرے بابا کے ایک دوست کے بیٹے تھے زاویار صاحب۔ وہ اس وقت صرف بیس سال کے تھے۔ ان کے بابا کی طبیعت کچھ خراب رہا کرتی تھی اور زاویار سب سے چھوٹے بیٹے تھے تو وہ اپنی حیاتی میں ہی زاویار کی شادی دیکھنا چاہتے تھے۔"، آنسو ان کے سپید و سرخ چہرے کو بھگو

www.novelsclubb.com

رہے تھے۔وہ اذیت اور تکلیف سے کہتی جا رہی تھیں۔

"میرے بابا نے میری شادی طے کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہ کیا تھا۔بلکہ مجھے تو بتایا ہی تب گیا تھا جب دو دن بعد میرا نکاح تھا۔مجھ میں تب بھی کچھ کہنے کی ہمّت نہ ہوئی تھی۔ بس سر تسلیم خم کر کے ان کے حکم کی تابعداری بجا لائی تھی۔اور کوئی آپشن ہی نہ تھا۔"،ابھی وہ مزید کہتیں کہ ایمان کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"کیوں نہ تھا؟"،وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔آنکھیں بھی سنجیدہ دکھتی تھیں۔

"کیونکہ میں کمزور تھی۔"،رضیہ نے اسی لہجے اور انداز میں کہا تو ایمان تلخی سے سر جھٹک کر ہنس دی۔

"جانتی ہیں امی۔۔۔میں کمزور نہیں ہوں۔میں چاہوں تو ابّا کو اس شادی سے منع کر سکتی ہوں۔۔۔مگر جانتی ہیں کہ میں کیوں نہیں منع کرتی؟"،اس نے پوچھا تو رضیہ انہی متورم سرخ آنکھوں سے اسے دیکھے گئیں۔وہ واقعی جاننا چاہتی تھیں۔ایمان نے کہنا جاری رکھا تھا۔

"جانتی ہیں امّاں؟یہ جو ماں ہوتی ہے نا،اس کا صرف آپ کے ساتھ کھڑے ہونا ہی آپ کو ایسی

www.novelsclubb.com

تقویت بخشتا ہے جس کا مقابلہ اس دنیا میں کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ماں ایک مضبوط چٹان کی مانند ہوتی ہے،ایک ٹھنڈی چھاؤں کی طرح، جس کے سائے میں اولاد پر اعتمادی اور بہادری کے ساتھ فیصلے کرتی ہے۔ باپ کا سایہ بھی اتنا مضبوط نہیں لگتا جب ماں کا سایہ سر پر موجود ہو۔ فطری طور پر ہی ایک بچہ جتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو جائے، زیادہ انسیت اسے ماں سے ہی ہوتی ہے۔"، وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی، رضیہ بیگم خوب سمجھ رہی تھیں۔ان کی آنکھوں سے متواتر آنسو ٹپکتے،ان کے گالوں کو بھگوتے جا رہے تھے۔اذیت بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔

"مجھے بھی آپ سے ہی انسیت تھی، امّاں۔ آپ کا ہی ساتھ درکار تھا۔ آپ کی ہی چھاؤں چاہیے تھی۔ ابّا سے مجھے بچپن سے ہی کوئی امید نہیں تھی۔ کسی بھی معاملے میں۔۔۔ مگر جن جن معاملات میں مجھے آپ سے امید رہی تھی ناں،"، اس نے ایک ٹھہر کر ایک گہرا سانس لیا تھا۔" ان معاملات میں آپ نے مجھے بہت مایوس اور ناامید کیا تھا۔"، اب کے ایمان کی سیاہ آنکھوں میں بھی اذیت اور تکلیف کی نمی چمکی تھی۔ وہ شدید ضبط کر رہی تھی۔ پوری طرح سے خود کو رونے سے باز رکھے ہوئے تھی۔

"مجھے ابّا نے توڑا تھا، امّاں۔ مگر بکھیرا آپ نے تھا۔ جب بچہ ہر جگہ سے ٹوٹا ہوا آئے تو ماں سنبھال کر جوڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر مجھے آپ نے سمیٹنے کے بجائے بکھیر دیا، امّاں۔"، اس کی اب کے ہچکی بندھ گئی تھی۔ آنکھوں سے دہکتے گرم گرم آنسو ابلتے ہوئے رخساروں کو گیلا کرتے جا رہے تھے۔ تکلیف بڑھ رہی تھی۔ حلق درد کرنے لگا تھا۔ رضیہ بیگم بھی سر جھکائے ہوئے تھیں۔ یوں جیسے وہ اپنی ساری غلطیوں کا اعتراف کر رہی ہوں۔ مان رہی ہوں کہ ہاں، وہ صحیح کہہ رہی ہے۔ جیسے مان رہی ہوں کہ ہاں، غلط وہی تھیں۔

"اور آپ جانتی ہیں کہ آپ نے اپنے لیے کوئی اسٹینڈ کیوں نہیں لیا تھا؟"، وہ ٹھہری تھی۔ انہیں دہکتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ "کیونکہ آپ کی ماں کا سایہ آپ کے سر پر نہیں تھا۔ آپ کی ماں نہیں تھی کہ آپ کو سپورٹ کرتی اور ہمّت بندھاتی۔ مگر میرے سر پر تو ماں ہوتے ہوئے بھی میں بے سہارا اور پست ہمّت رہی۔ کیونکہ میری ماں تو تھی، مگر میرے ساتھ نہیں تھی۔"

یہ باتیں دل چیر دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ وہ تکلیف اور شرمندگی میں گھری بیٹھی رہ گئی تھیں۔ ایمان اب بھی چپ کہاں ہوئی تھی؟ اب بھی کہہ ہی رہی تھی۔

"آدم بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔وہ بھی ابّا کی وجہ سے۔کیونکہ تب بھی جب ابّا ان کے ساتھ زبردستی کر رہے تھے تو آپ ان کے ساتھ نہیں کھڑی تھیں کہ انہیں سپورٹ کرتیں۔آپ ابّا کے برابر میں کھڑی روتے ہوئے بھائی کو ابّا کی بات ماننے پر اکسا رہی تھیں۔۔۔مگر مجھے فخر ہے بھائی پر کہ وہ نہیں دبے، بلکہ اپنی مرضی کی اور چلے گئے۔اور اچھا ہی ہوا جو وہ چلے گئے۔بہت اچھا ہوا۔"، وہ متورم آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔لب بھینچ رکھے تھے۔چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔رضیہ بیگم بہت دھیرے سے پلنگ پر ہتھیلیاں جما کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور سر جھکائے، آنسو بہاتی ہوئیں باہر چلی گئی تھیں۔پیچھے ایمان نے جلتی آنکھیں بند کر کے کھولی تھیں۔

www.novelsclubb.com

اذیت اور تکلیف روح کو اپنے شکنجے میں لیتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔تارے بھی ساتھ ہی جھلملاتے

جا رہے تھے۔ بادل کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ ایسے میں وہ جب سے گھر لوٹا تھا، بہت تھکا ہوا تھا۔ یہ تھکاوٹ شاید اس وعدے کے بھاری پن کے باعث تھی جو جاتے سمے ارتضی اس سے لے کر گیا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت مجبور محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اپنی چھت پر منڈیر پر ہاتھ رکھے، سر اٹھائے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ بھوری آنکھوں میں ویرانی تھی۔ یا پھر شاید کچھ اور! کچھ بے نام سا!

جبھی پیچھے چارپائی پر پڑا اس کا موبائل چنگھاڑا تو اس نے مڑ کر چارپائی کو دیکھا جس پر پڑے موبائل پر دو الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک افسردگی بھری مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ مڑ کر چارپائی تک گیا تھا۔ پھر کال ریسیو کرتا فون کان سے لگاتا، وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

"جی تو جناب۔۔۔ کیا حال ہیں آپ کے؟"، اگلی جانب سے ایک نسوانی آواز ابھری تھی۔ ایک مسکراتی ہوئی نسوانی آواز۔

"نہ سلام، نہ دعا۔۔۔ حد ہے، لڑکی۔ کب سدھرو گی تم؟"، اس نے مسکرا کر کہا تو اگلی جانب

اس نے زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔

"اوہ، سوری جناب۔ بھول گئی تھی۔ السلام علیکم محمد روحان یامین صاحب۔ کیا حال ہیں آپ کے ؟"، اس نے مسکراتے لہجے میں کہا تو وہ سر جھٹک کر ہنس دیا، پھر ایک بازو سر تلے رکھ کر وہیں پیچھے ہوتا، چارپائی پر لیٹ گیا اور نگاہیں وسیع سے پھیلے آسمان پر ٹکا دیں۔

"ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔ تم کیسی ہو؟"، اس کے پوچھنے پر اگلی جانب سے ایک دہائی کی آواز آئی تھی۔

"کیا بتاؤں بھئی۔ پھنسی ہوئی ہوں بہت بری طرح سے۔ پیپر ہیں کہ ختم ہو کر ہی نہیں دے رہے۔ مجھ معصوم کی تو صحیح چٹنی بن رہی ہے۔"، اس نے اگلی جانب سے کہا تو وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔

"ارے تم ہنس رہے ہو؟ شرم نہیں آتی کہ میرے دکھوں کا مذاق اڑا رہے ہو؟"، وہ تپ کر بول پڑی تھی۔ روحان مزید ہنسا تھا۔ خاموش پڑی چھت پر اس کے قہقہوں کی گونج تھی۔ اگلی جانب اس نے منہ بنایا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"ہنسنے کی ہی تو بات ہے۔۔۔ مطلب تم، حسنہ قیوم، پڑھ رہی ہے۔ پھر تو سلامی ہو تمہارے کالج والوں کو جو تم جیسی پڑھائی کی چور اور نکمّی لڑکی کو پڑھنے پر لگا دیا۔"، وہ مسکراتے لہجے میں بولا تو وہ بھی اب کے اگلی جانب سے کھلکھلا دی۔

"ہاں ناں۔ دیکھو تو سہی۔ مجھ جیسی کو پڑھا دیا۔ سلام تو ہونا چاہئے ان کالج والوں کو۔"، اس نے بولا تو وہ مزید ہنس دیا۔

"خیر تو ہے، روحان۔ آج بات بات پر ہنس رہے ہو؟"، اس نے یکدم ہی کچھ نوٹ کر کے اگلی جانب سے اچھنبے سے کہا تو اس کی ہنسی کو بریک لگا۔ وہ پھر سے سنجیدہ ہو گیا تھا۔۔۔ اور شاید رنجیدہ بھی! آنکھوں میں کچھ پلوں پہلے والی ویرانی پھر سے اُمڈ آئی تھی۔

"رضا چلا گیا لندن۔"، اس نے ہولے سے کہا تو حسنہ کے لب بے اختیار ہی اوہ کی سی صورت گول ہوئے۔ وہ جانتی تھی کہ روحان اور ارتضیٰ کا بچپن کا ساتھ تھا۔ وہ دونوں مونٹیسوری، اسکول، کالج حتّی کہ یونیورسٹی بھی ساتھ جاتے رہے تھے۔ ایسے میں وہ گیا تھا تو روحان کا اداس ہونا تو بنتا تھا۔

www.novelsclubb.com

"چلو، تم اس کے لیے دعا کرو کہ اللہ اسے کامیابی دے۔ اسے اس کے پیروں پر کھڑا کرے۔ اس کے تمام خواب پورے کرے۔"، اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو روحان نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

"بات یہ نہیں ہے، حسنہ۔"، وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں اضطراب تھا۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"تم کب آرہی ہو؟"، اس کے سوال کے بدلی میں پوچھا جانے والا یہ سوال نہایت غیر متوقع تھا۔ وہ ٹھٹھکی تھی۔

"کیوں؟"

"بتاؤ تو سہی۔"، وہ بضد ہوا تھا۔

"کل آؤں گی یا پھر پرسوں۔ کیوں؟"، وہ حیران ہوئی تھی۔ وہ ایسے تو کبھی نہیں بیہیو کرتا تھا۔ اس بار ایسا کیا مسئلہ تھا؟

"آؤ گی تو ہی بتاؤں گا۔ اور امی اور خالہ کا تو ضرور کہیں نا کہیں کا پلان بنا ہوا ہو گا پہلے سے۔ ہے

نا؟"، اس نے پوچھا تو حسنہ نے بے اختیار ہی اس کی بات کی تائید کی۔

"ہاں، انہیں قدسیہ خالہ کے ہاں جانا ہے۔"

"مومل آپی تو نہیں آ رہی ہیں نا؟"، اب کی بار پوچھا جانے والا سوال مزید غیر متوقع تھا۔ حسنہ کو اب کے فکر ہونے لگی تھی۔ وہ بے اختیار ہی بیڈ پر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں تشویش در آئی تھی۔

"نہیں۔"

"اور اظہر؟"

www.novelsclubb.com

"وہ بھی نہیں آ رہا۔"

"اوکے۔۔۔ پھر تم سے اکیلے میں ہی بات ہو گی۔ خیال رکھنا۔ شب بخیر۔ اللہ حافظ۔"، وہ تیزی سے کہہ کر ابھی فون رکھنے ہی والا تھا کہ اگلی جانب سے اس سے بھی تیزی سے وہ پوچھ بیٹھی تھی۔

"میاں جی۔۔۔ کیا ہوا ہے ؟"، وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی اور یہاں اس کی بات پر روحان نے ہلکے سے مسکرا کر آنکھیں موندی تھیں۔

"ذرا ایک اور بار کہو۔"، وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیا؟"، وہ ناسمجھی سے بولی تھی۔

"میاں جی۔"، اس نے بہت پیار سے کہا تھا۔ اگلی جانب حسنہ نے کافی بیزاری سے آنکھیں گھمائی تھیں۔

"ترسے ہوئے انسان۔ حد ہے۔ آکر بات ہو گی۔ خدا حافظ۔"، وہ کھٹاک سے فون رکھ گئی تھی۔

روحان نے فون کان سے ہٹا کر اپنے برابر میں ہی چارپائی پر رکھا تھا اور دوسرا بازو بھی سر تلے رکھ کر مسکرایا تھا۔

"لڑکی شرما گئی۔"، وہ خود سے بڑبڑایا تھا۔

☆☆☆

کراچی کے ایک پوش علاقے میں موجود رمیص جہانزیب کے گھر میں فجر اتر آئی تھی۔ آج صبح

سے ہی بادلوں نے آسمان کو گھیر رکھا تھا۔خوب حبس بنا ہوا تھا۔ایسے میں وہ کچن میں کھڑی چولہے پر دودھ گرم کر رہی تھی۔چہرے کے گرد نماز کے سے انداز میں گلابی دوپٹہ باندھ رکھا تھا۔شاید وہ ابھی ابھی نماز پڑھ کر ہی آئی تھی۔

شفاف سے چہرے پر آج ایک نرم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔آنکھیں بھی آج خلاف معمول نرمی سے مسکرا رہی تھیں۔

"میں جانتا تھا غزل کہ میرے لیے تم ہی بولو گی۔"، کسی کی گھمبیر سنجیدہ سی آواز اب تک سماعتوں میں گونج رہی تھی۔ایک رس سا گھول رہی تھی۔

"ایک تم ہی تو ہو جو میرے لیے لڑ رہی ہو۔۔۔میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ تمہیں سکون دے۔اطمینان دے۔"، وہ گھمبیر تا سے بس اتنے ہی جملے بولا تھا اور پھر رخصت ہو گیا تھا۔غزل کے چہرے کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی تھی۔دودھ گرم کر کے اس نے ارحم کے بیلے رنگ کے مگ میں انڈیلا اور پاس پڑے کپڑے سے مگ کو صاف کیا اور پھر ہلایا۔

www.novelsclubb.com

ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ کرسی لگا کر بیٹھی ثمرین بڑے ہی مزے سے اس کی یہ مسلسل مسکراہٹ ملاحظہ فرما رہی تھی۔ وہ کافی دیر سے اپنی باجی کو یونہی مسکراتا دیکھ رہی تھی۔ آخر صبر ختم ہوا اور زبان کی کھجلی بڑھی تو اس نے بول ہی دیا۔

"خیریت ہے باجی؟ بڑا مسکرایا جا رہا ہے آج؟"، اس نے ابرو اچکا کر مزے سے ہتھیلی کے پیالے میں چہرہ گراتے ہوئے کہا تو غزل نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔

"آج رمیص آئے تھے میرے خواب میں۔ جانتی ہو کیا کہہ رہے تھے؟"، وہ جوش اور خوشی سے بولی تو ثمرین کی آنکھیں پھیلیں۔

"کیا؟"

غزل چلتی ہوئی اس تک آئی تھی اور اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں جانتا تھا غزل کہ میرے لیے تم ہی بولو گی۔"، وہ فخر اور مسرّت سے کہہ رہی تھی۔ ثمرین

www.novelsclubb.com

کی آنکھوں میں نرمی در آئی تھی۔وہ مسکرائی تھی۔

"اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ایک تم ہی تو ہو جو میرے لیے لڑ رہی ہو۔۔۔میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ تمہیں سکون دے۔اطمینان دے۔"،اس نے رمیص کے کہے گئے الفاظ جوں کے توں دہرائے تو ثمرین مسکرادی۔

"اور؟اور کیا کہا انہوں نے؟"،اس نے یونہی مسکراتے ہوئے پوچھا تو غزل نے ہنوز یونہی مسکراتے ہوئے سر دھیرے سے نفی میں ہلا دیا۔

"بس اس کے بعد خدا حافظ کہہ کر پھر آنے کا کہتے چلے گئے تھے۔۔۔جانتی ہو ثمرین؟ان کے چہرے پر اتنا نور،اتنا اطمینان تھا ناں کہ بس۔اتنی پیاری مسکراہٹ تھی۔اتنا خوبصورت ان کا لباس تھا کہ بس۔۔۔اور وہ جہاں لوٹے تھے ناں،وہاں بھی اتنا نور،اتنی روشنی تھی کہ آنکھیں چندھیا جائیں۔"،اس کی بات پر ثمرین ایک بار پھر مسکرائی تھی۔

"ہاں ناں باجی۔۔۔آپ کو یاد ہے کہ ان کے چہرے پر کتنا نور تھا جب ان کی میّت آئی تھی۔کتنی پیاری مسکراہٹ تھی۔۔۔اور سب سے بڑی بات تو وہ نشانیاں۔میرے تو رونگٹے کھڑے ہو

گئے تھے۔۔۔سچ کہہ رہی ہوں۔"، وہ یاد کر کے پھر سے اسی بے یقینی کی کیفیت میں گھری کہہ رہی تھی۔ غزل بھی جیسے سب یاد کر کے مسکرائی تھی۔

ہاں اسے یاد تھیں وہ ساری باتیں! وہ وہ باتیں بھول ہی کیسے سکتی تھی؟ وہ کوئی بھولنے والی باتیں تو نہ تھیں؟ وہ نشانیاں کوئی عام نشانیاں تو نہ تھیں؟

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ حیدرآباد کے آسمان پر کئی سرمئی بادلوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ ہر جانب ایک چھاؤں سی تھی۔ ٹھنڈی تازگی بخش ہواؤں نے چل کر موسم کو مزید خوبصورتی بخشی ہوئی تھی۔ ایسے میں ایک سفید رنگ کے دو منزلہ مکان کے باہر ایک بائیک آ کر رکی تھی اور بائیک پر موجود شخص بائیک سے اترتا، اسے لاک کرتا، گھر کے دروازے کی جانب بڑھا تھا۔

دروازے تک پہنچ کر اس نے اپنا ہیلمٹ اتارا اور بستہ لٹکائے ہوئے کاندھے والے ہاتھ میں ہی ہیلمٹ پکڑ لیا۔ ہاتھ آگے بڑھا کر بیل بجائی اور پھر منتظر سا کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی سیکنڈز بعد دروازہ

ایک کلک کی آواز کے ساتھ اندر کی جانب کھلا تھا۔ وہ امّاں کو سلام کرتا اندر داخل ہوا تو امّاں نے بھی ہیلمٹ اس کے ہاتھ سے لیتے دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے ہی اندر چل پڑیں۔

"فریش ہو جا جا کر۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"، وہ کہتی ہوئی کچن کی جانب بڑھ گئیں تو وہ بھی سر ہلاتا اوپر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ تھکاوٹ بھرے انداز میں وہ سیڑھیاں چڑھ کر ابھی آدھے راستے پر ہی پہنچا تھا کہ سماعتوں سے کسی کے کھلکھلانے کی آوازیں ٹکرائیں تو پتلیاں ٹھہر سی گئیں۔ اگلے ہی پل وہ تیزی سے زینے پھلانگتا اوپر کی جانب بڑھا تھا۔

بالائی منزل کے چھوٹے سے لاؤنج کے بالکل وسط میں رکھے صوفوں میں سے ایک پر وہ بیٹھی رانیہ کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ اس کی گندمی رنگت دمک رہی تھی۔ جامنی رنگ کے شلوار قمیض کے ساتھ جامنی ہی دوپٹہ گلا میں ڈالے وہ نہایت پرکشش اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ دونوں پاؤں فولڈ کر کے اوپر صوفے پر ہی رکھے ہوئے تھے۔ رخ رانیہ کی جانب تھا۔ بالکونی سے آتی روشنی میں اس کا چہرہ مزید چمک رہا تھا۔ روحان کو تو وہ ویسے بھی ہمیشہ سے ہی خوبصورت لگا کرتی تھی۔

www.novelsclubb.com

سیڑھیوں پہ ہونے والی اس کے قدموں کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر نگاہیں اس کی طرف پھیریں تو اگلے ہی لمحہ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ در آئی۔اس کی سرمئی پر رونق آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔وہ اب کے ہلکا سا حیرانگی میں گھرا مسکرا دیا تھا۔

"السلام علیکم بھائی۔کیا حال ہیں؟"،رانیہ وہیں صوفے پہ بیٹھے بیٹھے بولی تو وہ سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیتا آگے بڑھ آیا۔حسنہ اسے دیکھ کر مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم جناب۔کیا حال چال ہیں؟"،وہ مسکرا کر بولی اور اس کے قریب آ کر سلام کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو روحان نے فوراً اسے تھام کر ملایا۔

"وعلیکم السلام بیگم صاحبہ۔۔میں تو ٹھیک ہوں۔آپ سنائیے۔"،وہ شوخ لہجے میں مسکرا کر کہتا ہوا اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر صوفوں کی ہی جانب بڑھ گیا۔صوفوں کے داہنے طرف کچھ ہی فاصلے پر بالکونی کا دروازہ کھلا تھا جس سے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اندر داخل ہو کر فضا کو ٹھنڈا کیے ہوئے تھے۔

"ویسے کیا ہی بتاؤں آپ کو،حسنہ بھابھی۔"،'بھابھی' پہ خاصا زور دے کر رانیہ نے روحان کی

جانب دیکھتے ہوئے جتا کر کہا تھا۔"میرے پیارے بھائی جان تو اپنی بیگم کو یاد کر کے راتوں کو سوتے نہیں ہیں۔اتنی بار امّاں سے کہہ چکے ہیں کہ رخصتی کروا دو مگر امّاں نے ہی کہا کہ ابھی پڑھ لکھ کر کچھ بن جا۔ورنہ بیوی کو کیا پانی اور ہوا پہ زندہ رکھے گا؟"،خوب جما جما کر،روحان کی خطرناک گھوریوں کو یکسر نظر انداز کر کے وہ مزے سے ہاتھ ہلا ہلا کر پٹر پٹر کہتی جا رہی تھی اور حسنہ کھلکھلا کر منہ پہ ہاتھ رکھی ہنستی چلی جا رہی تھی۔پھر ایک ابرو اٹھا کر مسکرا کر روحان کو دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلا یا۔

"زیادہ خوش فہمیاں پالنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔ایسا کچھ نہیں ہے۔"،وہ تپ گیا تھا۔ مگر حسنہ اور رانیہ اسے مزید تپانے میں لگی ہوئی تھیں۔وہ آنکھیں شرارتی انداز میں سکیڑے ابرو اچکا کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"تم لوگوں کے ساتھ تو بیٹھنا ہی فضول ہے۔خالہ کہاں ہیں؟"،وہ تپ کر کہتا اٹھ کھڑا ہوا تو وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔وہ سر جھٹکتا اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا جہاں اس کی خالہ بیٹھی تھیں۔پیچھے وہ دونوں اب خاصی بلند آواز میں جان بوجھ کر اسے چڑانے کو قہقہے لگا رہی

تھیں۔

☆☆☆

کراچی پر شام نے اپنے پر پھیلانا شروع کیے تو ہر سو گہری رونق اور روشنیاں بحال ہونے لگیں۔ روشنیوں کے شہر میں اب کے روشنیاں پوری طرح سے جلتی، جگمگ کر رہی تھیں۔ایسے میں رمیص جہانزیب کے گھر کے پیارے سے لان میں اس وقت کرسیوں پر دو لگ بیٹھے ہوئے تھے۔

سرمئی رنگ کے سادہ سے شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ دوپٹہ شانوں پر پھیلائے، وہ سنجیدہ سی اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ ہیزل رنگ آنکھوں میں ہنوز ویسی ہی ویرانی اور خاموشی تھی۔ چہرہ سپاٹ اور سنجیدہ سا تھا۔

"غزل۔۔۔ریلیکس کرو یار۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"،اس کے سامنے بیٹھی تقریباً اس ہی کی عمر کی لڑکی اس سے کہہ رہی تھی۔اس کی آنکھیں بڑی بڑی سی، نیلے رنگ کی تھیں۔ پلکوں پر بھی

مسکارا لگا کر انہیں اور گھنا کر رکھا تھا۔ آنکھوں کے ہی ہم رنگ شلوار قمیض پہنے، گلے میں دوپٹہ ڈالے، وہ اپنے لمبے بھورے بال پشت پہ کھولے ہوئی تھی۔ چہرہ مزید کسی بھی قسم کے سنگھار سے بالکل پاک تھا۔ صرف یہ مسکارا ہی اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہا تھا۔

"میں نے کیا کیا ہے یار؟ تم مجھے بتاؤ۔"، غزل اس کی بات پر سیدھی ہوتی ہوئی کچھ اکتاہٹ سے بولی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی کے ساتھ ساتھ اکتاہٹ بھی واضح نظر آتی تھی۔ "تم جب سے آئی ہو، میں بہت آرام سے، خاموشی سے، تمہاری بات سن رہی ہوں۔ ہاں میں ہاں اور نہ میں نہ بھی ملا رہی ہوں۔ تمہارے کسی بھی نقطۂ نظر کو رد نہیں کر رہی۔ تم کیا چاہتی ہو کہ میں اور کیا کروں؟"

"کیس چھوڑ دو، غزل۔ کیوں خود کو اور اپنے بچوں کو خطرے میں ڈال رہی ہو؟"، اس کی بات پر غزل نے آنکھیں گھما کر کہنی کرسی کے ہتھے پر رکھ کر اسے عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں ایک افسوس سا در آیا تھا۔

www.novelsclubb.com

"تم مجھے سائیڈ پر رکھو، زارا۔ اپنا سوچو۔ اگر خدانخواستہ اکبر بھائی کے ساتھ بھی کوئی یہ سب کرے، تمہارے بچوں کے سر پر اللہ ان کے باپ کا سایہ سلامت رکھے، مگر میری والی کنڈیشن تمہاری ہوتی تو کیا تب بھی تمہارا یہی فیصلہ ہوتا؟"، وہ یہ بات کہنا نہیں چاہتی تھی مگر اب اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے اور سمجھانے کا اسے یہی طریقہ سمجھ آیا تھا۔ زارا اس کی بات پر کچھ پل کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر واضح طور پر ایک سایہ سا لہرایا تھا۔ پتلیاں کچھ پلوں کے لیے ساکت ہوئی تھیں۔ کچھ لمحوں بعد اب کے جب وہ بولی تو آواز اور انداز پست تھا، مگر بات وہی تھی۔

"ہاں، میں تب بھی یہی کہتی۔ ضروری ہے کہ اگر انسان کسی ایک کو کھو چکا ہے تو اس کے پیچھے باقیوں کو بھی کھو دے؟ یہ کہاں کی عقلمندی ہے، غزل؟"، اس کی اس بات پر غزل اسے دیکھ کر اب کے بہت ہی ہلکا سا مسکرائی تھی۔ اس کی آنکھوں کی تپش بڑھ گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی۔۔۔ وہ واقعی اصل معاملہ سمجھ گئی تھی۔

"تم جانتی ہو کیا، زارا؟ میں کمزور نہیں ہوں۔ جیسے تم ہو، جیسے ثمرین ہے، جیسے میرے پاپا

ہیں۔"، اس کی اس دوٹوک بات پر زارا کا رنگ پھیکا پڑا تھا۔ غزل سمجھدار تھی، یہ بات تو وہ جانتی تھی۔ مگر وہ اتنی جلدی سارا ماجرا سمجھ جائے گی، اس کی اسے توقع نہ تھی۔ "پاپا سے جا کر کہنا کہ اگر انہوں نے اس سب میں مجھے سپورٹ نہ کیا، تو قیامت کے روز میں ان کو بھی اپنے ساتھ نہیں، اپنے سامنے کھڑا کرواؤں گی۔ اللہ سے کہوں گی کہ یا اللہ، جس شخص کو تو نے میرا باپ بنا کر بھیجا، جسے تو نے میرا کفیل بنا کر بھیجا، وہ دشمنوں کے ساتھ جا ملا۔۔۔ دشمنوں کے ساتھ ملنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان کا ساتھ دیا جائے۔ کبھی کبھار دشمنوں کے ساتھ ملنے کا مطلب اپنوں کا ساتھ نہ دینا بھی ہوتا ہے۔ میرے بچوں، میرے شوہر اور میرے گنہگاروں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو میرے خلاف ہیں، جو میرا ساتھ نہیں دے رہے، جو میری ہمّت توڑنا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔"، بولتے بولتے اس کا تنفس پھولنے لگا تھا۔ سپید چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

زارا اسے دھواں ہوتے کانوں اور سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ غزل کے اندر اتنا کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس کا مضبوطی کا خول ٹوٹنے لگا تھا۔ ٹوٹ کر بکھرنے

لگا تھا۔ وہ ٹوٹی بھی اپنی ہم راز کے سامنے تھی۔ اپنی بچپن کی ساتھی کے سامنے تھی۔

"میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ مجھے اور کوئی نہیں چاہیئے۔ جا کر بتا دینا تم ان کو بھی کہ نہیں چاہیئں اب وہ مجھے۔ نہ ان کی مدد چاہیئے اور نہ ہی ان کا ساتھ۔ میرا اللہ میرے لیے کافی ہے۔ وہ بہترین کارساز ہے۔ وہ میرا مالک بھی ہے اور میرا مددگار بھی۔ بات ختم اب۔ بس!"، آخر میں ہاتھ اٹھا کر وہ بولی تھی۔ آنسو تیزی سے اس کے گالوں پر سے لڑھکتے جا رہے تھے۔ سرخ متورم آنکھیں اس نے اگلے ہی پل بے دردی سے رگڑ ڈالی تھیں۔ مسل ڈالی تھیں۔ بس اب بہت ہو گیا تھا! بہت زیادہ!

☆☆☆

شام حیدر آباد پر اتری تو زاویار احمد صاحب کے گھر میں خوب رونق جم گئی۔ آج ایمان کی ڈھولکی تھی سو اس کی ساری کزنز بھی ان کے گھر پر ہی آ گئی تھیں۔ صحن میں خوب گہما گہمی کا راج تھا۔ صحن کے وسط میں ایک دری بچھا کر اس پر بہت سی لڑکیاں بیٹھی مہندی کے گیت گانے میں

مصروف تھیں جبکہ ایک جانب ایک لکڑی کا جھولا رکھا گیا تھا جس پر ایمان بیٹھی تھی۔

پیلے جوڑے میں ملبوس، سر جھکائے، نگاہیں اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر ٹکائے، وہ ویران سی دکھتی تھی۔ پھولوں کے جھمکے اور گجرے جیولری کے طور پر پہن رکھے تھے۔ مختلف خواتین آ کر اس کے برابر میں بیٹھتیں، اس پر سے نوٹ وارتیں، تھوڑی سی مٹھائی کھلاتیں اور خود بھی کھاتیں، اور پھر اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر چلی جاتیں۔

لڑکیاں ڈھول پر گیت گنگنانے میں مصروف، خوب شور مچا رہی تھیں۔ فاطمہ بھی انہی میں بیٹھی تھی۔ ڈھول کے دوش پر زوروں سے گنگناتی وہ بھی پیلے اور گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی تھی۔ اس کے برابر میں ہی شانزے بیٹھی تھی۔ نک سک سی تیار وہ آج بھی ہمیشہ کی ہی طرح مغرور لگ رہی تھی۔

صحن میں چونکہ لڑکیاں تھیں تو کسی بھی مرد کو وہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ جبھی اس کے برابر میں زرینہ آ کر بیٹھیں تو اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر نم آنکھوں

سے مسکرادی تھیں۔

"مجھے معاف کر دو، بیٹے۔ میں انجانے میں تمہارے اور رضا کے ساتھ زیادتی کر گئی۔ مجھے معاف کر دو۔"، انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا تو اس کی آنکھوں میں نمی چمکی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکا تھا۔ لب بھینچ کر اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"معافی مت مانگیے، خالہ۔ آپ کی غلطی نہیں ہے۔ غلطی شاید کسی کی بھی نہیں ہے۔ قسمت تھی یہ میری۔ اور قسمت کو آج سے پہلے کبھی کوئی بدل پایا ہے جو اب بدل پاتا؟"، وہ زخمی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ زرینہ نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوما تھا اور پھر اس کے چہرے پر نرمی سے ہاتھ پھیرتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

www.novelsclubb.com

پورے وقت میں اسے رضیہ ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھیں۔ نجانے شرمندگی تھی یا کیا، مگر وہ اس کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھیں۔ ایمان کو اب کے ان کی فکر ہونے لگی تھی۔ اسے انہیں وہ سب نہیں کہنا چاہئے تھا۔ جب قسمت کے آگے سر جھکا دیا تھا تو شکوہ بھی نہیں کرنا چاہئے تھا۔

ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ جب رب کی لکھی قسمت کے آگے سر جھکایا جاتا ہے تو پھر شکوہ نہیں کیا جاتا!

ہاں ایسی ہی تو ہوتی ہیں ہم مشرقی لڑکیاں۔دوسروں کو شرمندہ کرنے پر بھی خود ہی شرمندہ ہو جاتی ہیں۔ہک ہاہ!

کافی دیر تک خوب ہنگامہ چلتا رہا اور پھر بالآخر جب سب ادھر ادھر ہو گئے تو روشنیاں بجھادی گئیں۔بتیاں گل کر دی گئیں۔سجاوٹ ہٹادی گئی۔کل ایمان کا نکاح اور رخصتی تھی۔ساری کزنزرات وہیں رکنے کا پلان بنائے وہاں ٹھہر گئی تھیں۔

گھر کے وسیع و کھلے سے صحن میں تمام مردوں کا انتظام کیا گیا تھا جن میں زاویار صاحب، زرار اور ان کے کچھ کزنز وغیرہ شامل تھے۔جبکہ اندر تمام کمروں میں لڑکیاں وغیرہ تھیں۔شانزے کی دونوں بہنیں بھی رکنے آئے ہوئی تھیں جو کہ اس کے ساتھ ہی اس کے کمرے میں سو رہی تھیں۔

جبکہ باقی کزنز رضیہ کے کمرے میں موجود تھیں۔ایمان کو اس کے کمرے میں ہی مایوں بٹھایا گیا تھا، سو رضیہ نے وہاں اور کسی کو سونے سے منع کیا تھا۔ویسے یہ ضروری تو نہ تھا، مگر پھر بھی ان

کے حکم کی فرمانبرداری سبھی لوگوں نے کی تھی۔

رات کے بارہ بجے تو گھر پوری طرح سے تاریک ہو گیا۔ باہر صحن میں بچھی چارپائیوں پر تمام مرد حضرات محو نیند تھے جبکہ اندر بھی تاریکی چھا چکی تھی۔ جھینگر کی سوں سوں کے علاوہ اور کوئی آواز سماعتوں سے نہ ٹکراتی تھی۔ وہ خاموش سی اپنے کمرے کو تاریک کیے، گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کے آگے مایوں کے زرد پردے ڈالے گئے تھے۔

دونوں نازک سے ہاتھوں پر کہنیوں تک مہندی کے نقش و نگار آویزاں تھے۔ بال ڈھیلی سی چوٹی میں بندھے ہوئے تھے۔ سیاہ آنکھوں کی ویرانی ویسی ہی تھی۔ چہرہ پر کیا گیا ہلکا پھلکا میک اپ اب تک موجود تھا۔ ہر جانب پھیلی خاموشی میں گھری وہ بھی اسی خاموشی اور سناٹے کا حصّہ معلوم ہوتی تھی۔

جبھی خاموشی میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا تھا۔ کوئی لمبی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے یکدم ہی گھٹنوں پر سے چہرہ اٹھا کر ادھر ادھر نگاہیں گھمائی

www.novelsclubb.com

تھیں۔کون آیا تھا اس کے کمرے میں ؟وہ بھی اس وقت ؟وہ بھی امّاں کے منع کرنے کے باوجود ؟

کچھ قدم زرد پردوں کی جانب بڑھتے سنائی دیے تھے۔کسی کے نرم سے دبے دبے قدم تھے جو اب اس کے پردوں کے بالکل باہر پہنچ چکے تھے۔اگلے ہی لمحہ اسے پردوں کے باہر سے روشنی جلتی دکھائی دی تھی۔وہ شاید کسی مدھم موم بتی کی مشعل تھی جس کی لو تاریکی میں ٹمٹماتی ہلکی ہلکی روشنی پیدا کر رہی تھی۔

نرمی سے دھیرے سے کسی نے ہاتھ آگے بڑھا کر پردے ایک جانب سرکائے تھے۔ایمان پریشان سی بیٹھی تھی۔اگلے ہی لمحے پردے جدا ہوئے تو سامنے رضیہ بیگم کا ستا ہوا، بھیگا ہوا سا سرخ چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ان کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔چہرہ بھی سرخ پڑ کر دہک رہا تھا۔انہوں نے ہاتھ میں تھامی موم بتّی ایک جانب زمین پر رکھی تھی اور زرد سنہری سی روشنی میں چمکتے ایمان کے چہرے کو دیکھا تھا۔

"امّاں؟"، وہ پریشان سی ہو کر آگے بڑھی تھی اور ان کے بوڑھے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے تھے۔ وہ اتنی عمر رسیدہ نہیں تھیں جتنی لگا کرتی تھیں۔ عورت بوڑھی عمر کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اسے بوڑھا رویے کر دیتے ہیں۔ ایک عمر رسیدہ عورت کا شوہر بھی اگر اس کے ساتھ نرمی اور محبت کا سلوک کرے تو وہ بھی جوان اور زندہ دل ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی بیس سال کی لڑکی شوہر کی ذلّت اور دھتکار برداشت کر رہی ہو تو وہ بھی پچاس سال کی لگنے لگتی ہے۔

رضیہ بیگم محض چھپن سال کی تھیں مگر لگتیں وہ بھی ساٹھ پینسٹھ سال کی تھیں۔ وہ ایمان کے ہاتھ تھامتے ہی پھپھک کر رو دی تھیں۔ آنسو ایک بار پھر ان کے بھیگے ہوئے گالوں کو بھگونے لگے تھے۔ ایمان نے پریشانی سے آگے بڑھ کر ان کو اپنے گلے سے لگایا تھا۔

"مجھے معاف کر دو میرے بچے۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔"، وہ روتے ہوئے کہتی جا رہی تھیں اور وہ ان کی پیٹھ تھپکتی مسلسل نفی میں سر ہلاتی، انہیں چپ ہونے کا کہتی جا رہی تھی۔

"تمہیں بچپن سے لے کر اب تک میں نے کبھی سپورٹ نہیں کیا۔ تمہارے باپ نے تمہارے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ تم بدصورت ہو، میں نے تب بھی کچھ نہیں کہا۔ تمہارے باپ نے

تمہیں سب کے سامنے کئی دفعہ ذلیل کیا، میں تب بھی چپ رہی۔۔۔اس نے تمہارا رشتہ تم سے دگنی عمر کے آدمی سے کر دیا، منگنی کر کے خود ہی نکاح کی تاریخ رکھ آئے، میں نے تب بھی کچھ نہیں کیا۔مجھے معاف کر دو، ایمان۔۔۔مجھے معاف کر دو۔"، وہ روتی بلکتی ہوئی کہتی جا رہی تھیں۔ایمان نے نرمی سے انہیں خود سے دور کیا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ابھی اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔

"آج مجھے اعتراف کرنے دو، ایمان۔"، ایمان چپ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھی جو پچھتاوے میں گھری سر نفی میں ہلاتی جا رہی تھیں۔رضیہ بیگم نے ایک بار پھر روتے ہوئے بولنا شروع کیا تھا۔

"میں ماں ہوں نا۔جان گئی تھی کہ تم ارتضی کو پسند کرتی ہو۔(ایمان نے دکھتی آنکھیں بند کی تھیں۔اس ذکر سے ہی تو وہ بچنا چاہتی تھی۔) مگر تب بھی میں نے کچھ نہیں کیا۔وہ بچّہ خود آیا میرے پاس بات کرنے۔۔۔"، ایمان نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

آنکھوں میں بے یقینی اور نا سمجھی سمائی ہوئی تھی۔ ارتضی رضیہ کے پاس آیا تھا؟ مگر کب؟ اسے کیسے پتا نہیں چلا؟ اور ارتضی نے بتایا کیوں نہیں؟

"میں نے اس کا مان بھی نہیں رکھا۔۔۔ مجھے معاف کر دو، ایمان۔ مجھے معاف کر دو۔"، وہ سر مسلسل نفی میں ہلاتیں، شرمندگی سے کہتی جا رہی تھیں اور ایمان نم آنکھیں لیے انہیں دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ الفاظ اور جملے گویا ختم ہو گئے تھے۔ صرف خاموشی تھی۔ ایک عجیب سی خاموشی!

اور کبھی کبھی خاموشی بھی وہ کچھ کہہ جاتی ہے جو الفاظ نہ کہہ سکیں۔ اس کی خاموشی بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی خاموشی بھی بہت سے اعلان کر رہی تھی۔

"تم صحیح کہتی ہو، ایمان۔ مائیں ساتھ ہوں تو انسان کو تقویت رہتی ہے۔ باپ کے سائے سے زیادہ انسان کے لیے ماں کا سایہ ضروری ہوتا ہے۔ مگر میں نے تمہیں ہمیشہ بے سایہ رکھا۔ مجھے اس کے لیے معاف کر دو۔"، وہ ہاتھ جوڑ کر بولیں تو ایمان نے تڑپ کر سر نفی میں ہلایا۔ اس کا

اضطراب اور بے چینی بڑھ گئی تھی۔

"ماں باپ اپنے بچوں سے معافی مانگتے ہوئے اچھے نہیں لگتے، امّاں۔"، ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر وہ نیچے کرتے ہوئے بولی تھی۔ "یہ تو آپ ہیں۔۔۔ اگر ابّا بھی میرے سامنے ہوتے اور وہ ہاتھ جوڑ رہے ہوتے، تو میں ان کو بھی ہاتھ جوڑنے نہیں دیتی۔ بچّے ماں باپ کو جھکانا نہیں چاہتے۔ مگر احساس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ احساس دلانا ضروری ہوتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ کوئی آپ کو آپ کی غلطیوں کا احساس دلا رہا ہے تو وہ آپ سے معافی منگوانا چاہتا ہے۔ صرف احساس کافی ہوتا ہے، معافی ضروری نہیں ہوتی۔"

"آج میں اپنی تمام غلطیوں کا مداوا کرنا چاہتی ہوں، ایمان۔ میں آج سے تمہارے ساتھ کھڑی ہوں۔ تم جو چاہو گی، جیسے چاہو گی، وہی ہو گا۔"، کہتے ہوئے انہوں نے پردے کے پیچھے سے ایک سیاہ چمڑے کا بستہ نکال کر اس کے سامنے کیا تھا۔ ایمان نے انہیں نا سمجھی سے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"، اس نے نا سمجھی سے پوچھا تھا۔ شاید اسے سمجھ آ رہا تھا مگر وہ پھر بھی نہیں سمجھنا چاہتی تھی۔

"باہر روحان یامین کھڑا ہے، ایمان۔ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ وہ تمہیں بس اڈّے تک پہنچا دے گا۔ تم کراچی چلی جانا۔ گھر کا پتہ اور چابی وغیرہ بھی اسی بستے میں ہے۔"، اور ان کی اس بات پر ایمان کو اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"روحان یہاں کیوں آیا ہے، امّاں؟"، اس کو اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی معلوم ہوئی تھی۔ ذہن سن ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ نم آنکھوں کی نمی آنسو بن کے گالوں پر بہتی چلی گئی تھی۔ رضیہ بیگم اس کی بات سن کر دھیرے سے مسکرائی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ میں فخر تھا، بغاوت تھی، غداری تھی۔ ایمان کو کسی چیز کے غلط ہونے کا احساس شدّت سے ہوا تھا۔

"امّاں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ مجھے سمجھ نہیں آرہا کچھ۔"

بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ ناسمجھی عنقا ہوئی تھی، سمجھ کے پہلو کھلنے لگے تھے۔

"اس بستے میں وہ سارے زیور ہیں جو میں نے تمہارے لیے رکھے تھے۔ جو زاویار نے تمہیں دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ یہ سارے زیورات بھی فاطمہ کو دینا چاہتے تھے۔ حالانکہ

www.novelsclubb.com

فاطمہ کے لیے میں نے الگ رکھے تھے مگر وہ اس معاملے میں بھی تمہارے ساتھ ناانصافی کرنا چاہتے تھے۔۔۔ یہ سارے زیور تمہارے ہیں، ایمان۔ اور یہ تمہارے پاس ہی رہنے چاہئیں۔"، وہ آنکھوں میں عجیب تپش لیے کہہ رہی تھیں۔ ایمان کے لیے اپنی سماعت پر یقین رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ انہیں دیکھتی اور سنتی جا رہی تھی۔

"اس کے علاوہ اس میں کچھ نقد رقم ہے جو تمہارے کام آئے گی اور میرا موبائل ہے جس میں ایک نئی سم ڈالی ہے میں نے اور اس میں آدم کا پرانا نمبر اور اپنا نیا نمبر سیو کر دیا ہے۔۔۔ یوں تو آدم وہ نمبر استعمال نہیں کرتا، مگر پھر بھی میرا دل کیا تو میں نے وہ نمبر اس میں ڈال دیا۔ کچھ کپڑے ہیں۔ ایک چادر ہے اور دو جوتیوں کی جوڑیاں ہیں۔ یہ ساری اشیاء تمہارے کام آئیں گی۔ تم فکر بالکل مت کرنا۔ میں یہاں سب سنبھال لوں گی۔"، کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور موم بتّی زمین سے اٹھاتیں دروازے تک گئی تھیں اور دروازہ بند کیا تھا۔ دروازے کے پیچھے لٹکے برقعوں میں سے ایک کھلا سا برقع اور نقاب نکال کر اس تک آئی تھیں۔

"یہ جلدی سے پہنو اور بستہ کاندھے پر لٹکا کر باہر آؤ۔ اور ہاں، مجھ سے رابطے میں رہنا۔"، کہتے

ہوئے انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا اور اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتیں باہر چلی گئی تھیں۔ ایمان نے بمشکل خود کو اٹھا کر ان کی بات پہ عمل کرنا شروع کیا تھا۔ وہ واقعی نہیں جانتی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔

اور جو رضیہ زاویار آج اس کے سامنے آئی تھیں، وہ تو انہیں بھی نہیں جانتی تھی۔ کیا وہ واقعی اتنی بہادر ہو گئی تھیں؟ اتنی بے خوف؟ اتنی نڈر؟ یعنی انہوں نے سب کچھ پہلے ہی پلان کر رکھا تھا۔ اتنی حاضر دماغی؟ اتنی دلیری؟

☆☆☆

کچھ گھنٹوں قبل۔۔۔

روحان یامین کے گھر میں اس قت گہری خاموشی چھائی تھی۔ بالکونی کے فرش پر ریلنگ سے ٹیک لگائے اس وقت دو لوگ بیٹھے تھے۔ ایک سرمئی آنکھوں والی لڑکی اور دوسرا بھوری آنکھوں والا لڑکا۔

"تم نے یہ سب مجھے فون پر کیوں نہیں بتایا، روحان؟"، لڑکی پریشانی سے لڑکے سے پوچھ رہی تھی جس کے جواب میں اس نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کیا تھا۔

"فون پہ بتایا نہیں جاتا مجھ سے۔"، اس نے مدھم سی آواز میں کہتے ہوئے سر اٹھا کر سامنے چھت سے لٹکتے چھوٹے سے فانوس کو دیکھا تھا جس کی ہلکی سنہری سی روشنی پوری بالائی منزل کو نیم روشن سا کر رہی تھی۔ فانوس کی پتلی پتلی چمچماتی ہوئی لڑیاں گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ان چمچماتی لڑیوں کو دیکھے گیا۔

"اب کیا کرو گے؟"، لڑکی نے ایک اور سوال پوچھا تھا۔

"جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کروں گا۔"، اس نے یونہی فانوس کو دیکھتے، کھوئے کھوئے سے انداز میں، بالکل مدھم سے آنچ دیتے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"کیا مطلب؟ تم اس کے پاس جاؤ گے؟"، حسنہ بے ساختہ ہی مڑ کر پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ روحان نے سر اور نگاہیں پھیر کر اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"اور اگر اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا تو؟"، وہ پریشان تھی۔ اور متفکر بھی۔ آنکھوں میں

www.novelsclubb.com

تشویش جھلکتی تھی۔روحان مسکرایا تھا۔

"اللہ ہے نا!"، کہتے ہوئے اس نے نگاہیں پھیر کر پھر سے فانوس کو دیکھا تھا۔وہ سنہری افشاں اب بھی ہر سو بکھیر رہا تھا۔جبھی اچانک اس کے برابر میں پڑا اس کا فون تھر تھرایا تو اس نے فون اٹھا کر اسکرین کو دیکھا۔اسکرین پر "رضیہ خالہ" کا نام جل بجھ رہا تھا۔وہ کچھ حیرت سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"ہیلو؟"،اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے اچھنبے سے کہا تھا۔حسنہ بھی اسے دیکھتی، سماعت اس کی بات پہ ہی ٹکائے ہوئے تھی۔

"السلام علیکم روحان بیٹے۔۔۔"،وہ اگلی جانب سے نرم سے لہجے میں بولی تھیں۔

"وعلیکم السلام خالہ۔خیریت؟"،اس وقت فون آنا،وہ بھی رضیہ خالہ کا، تھوڑا تشویش ناک تھا۔روحان کی تو ان سے نہایت رسمی سی علیک سلیک تھی۔

"جی بیٹے۔سب خیریت ہے۔۔۔بس آپ سے ایک کام تھا۔"،وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے لب کترتی

www.novelsclubb.com

اگلی جانب سے بول رہی تھیں۔روحان مزید سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"جی خالہ۔کہیے۔میں سن رہا ہوں۔"، سراپا کان بنا وہ انہیں سننے کو بے تاب تھا۔

"کل ایمان کا نکاح ہے، بیٹے۔"، اور ان کی اس بات پہ روحان کو اپنے آس پاس دھماکے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ارتضی نے اسے یہ بات تو نہیں بتائی تھی۔تشویش اور فکر بڑھ گئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں یکدم ہی تیز ہوئی تھیں۔

"ک۔۔۔کیا؟"

"جی بیٹے۔ارتضی بیٹے نے مجھ سے کہا تھا کہ ایمان کے معاملے میں مجھے جب بھی آپ کی کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت پڑے، آپ سے رابطہ کر لوں۔"، انہوں نے اب کے بات کا صحیح سے آغاز کیا تو وہ غور سے سننے لگا۔حسنہ پورے وقت میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بخوبی ملاحظہ کر رہی تھی۔

"اچھا خالہ۔۔۔آپ ایسا کریں کہ ایمان کو تیار کریں۔میں انہیں لینے آ رہا ہوں۔"، اس نے ان

کی پوری بات سننے کے بعد آخر میں کہا تو حسنہ کی آنکھیں ناسمجھی سے پھیلیں۔ آخر کیا بات ہو رہی تھی؟

"جی جی۔ بس میں چند ہی منٹوں میں پہنچ رہا ہوں۔۔۔ آپ فکر مت کیجئے۔"، وہ کہتا ہوا خدا حافظ کہتا فون رکھ گیا تھا۔

"کیا ہوا، روحان؟"، وہ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ "اس وقت کہاں لے کر جا رہے ہو اس لڑکی کو؟"، اس کی بات سنتے ہی روحان نے نرمی سے اسے دیکھ کر اس کے ہاتھ تسلی کے سے انداز میں دبائے تھے۔ اور ہولے سے مسکرایا تھا۔

"مجھ پر بھروسہ رکھو، حسنہ۔"، وہ اس کے دل کی بات نجانے کیسے سمجھ گیا تھا۔ حسنہ نے بے اختیار ہی نگاہیں شرمندگی سے جھکائی تھیں۔ افسوس کہ وہ اس کی آنکھیں پڑھ گیا تھا۔ "میں وہاں صرف اپنا وعدہ نبھانے جا رہا ہوں۔ اور کچھ نہیں۔"

حسنہ نے نم آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر سمجھ کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"خیال رکھنا اپنا بھی اور رانیہ کا بھی۔ میرے جاتے ہی گھر کو اچھے سے لاک کر دینا اور جب تک میں نہ آجاؤں، دروازہ کسی کے لیے بھی نہ کھولنا، سمجھی؟"، وہ اٹھتا ہوا کہہ رہا تھا اور حسنہ بھی سمجھتے ہوئے سر ہلاتی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔

"دعا کرنا، حسنہ۔ ایمان بہت تکلیف میں ہیں۔ میرے دوست کے لیے اور ان کے لیے دعا کرنا۔"، وہ نرمی سے اس کا شانہ تھپتھپاتا اندر کی جانب بڑھ گیا تو وہ بھی سر ہلاتی اس کے پیچھے پیچھے ہی اندر چلی آئی۔ وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا تو وہ بھی پیچھے پیچھے ہی اس کے ساتھ چلی آئی۔ وہ اپنی الماری میں سے اپنی گن نکال رہا تھا۔

حسنہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ روحان کو خطرہ ہے۔ وہ خود بھی خوف زدہ ہے مگر کہہ نہیں رہا۔ جبھی اسے اچانک سے کچھ یاد آیا تو اس کے کمرے سے دوڑتی ہوئی باہر نکلتی رانیہ کے کمرے کی جانب گئی جہاں وہ آج کل اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔

کچھ پلوں بعد جب وہ واپس لوٹی تو وہ بالکل تیار سا، اپنا جیکٹ پہنے، ہیلمٹ ہاتھ میں تھامے،

لاؤنج میں اس کا منتظر کھڑا تھا۔وہ اسی کی جانب چلی آئی تھی۔

"یہ لو۔"،اس نے اس کی جانب ایک سیاہ شاپر بڑھایا تو روحان نے نا سمجھی سے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"یہ میری چادر ہے۔ بالکل نئی ہے۔ کل ہی یہاں آتے ہوئے خریدی تھی۔ یہ ایمان کو دے دینا۔۔اور اس میں کچھ چھوٹی موٹی کھانے پینے کی چیزیں بھی ہیں۔ان کے کام آئیں گی۔"،وہ نرمی سے بولی تو وہ اسے دیکھتا ہلکا سا مسکرا دیا، پھر شاپر اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے شانے سے اسے ہلکے سے اپنے ساتھ لگایا۔

"بڑی نرم دل ہے میری بیوی۔"،وہ مسکرا کر کہتا الگ ہوا تھا اور نیچے کو جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔وہ بھی دروازہ بند کرنے اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

نیچے پہنچ کر وہ ابھی باہر نکلنے ہی والا تھا کہ وہ پیچھے سے بول پڑی۔

"روحان۔"،روحان نے چہرہ موڑ کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"میرے خیال سے بائیک پر جانا مناسب نہیں رہے گا۔ تم یوں کرو کہ میری گاڑی لے جاؤ۔"،

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

روحان چند پل اسے سوچتی نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر سر ہلاتا ہوا میز کی جانب بڑھ گیا۔ اپنا ہیلمٹ میز پر رکھا اور حسنہ کی جانب مڑا جو اپنی گاڑی کی چابی شیلف سے اٹھا کر اس کی جانب ہی آ رہی تھی۔

"تھینک یو سو مچ حسنہ مجھے سمجھنے کے لیے۔"، وہ مسکرا کر بولا تو وہ بھی نرمی سے مسکرا دی۔

"نو نیڈ۔ خدا حافظ۔"

☆☆☆

موجودہ وقت۔۔۔

رات کی سیاہ تاریکی میں آج چاند بھی آسمان پر موجود نہ تھا۔ زاویار احمد صاحب کے گھر کے صحن میں اس وقت سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ایسے میں اندرونی لوہے کے دروازے کو پار کرتے دو لوگ باہر نکلے تھے۔

وہ دونوں دبے پاؤں چلتی ہوئیں مین گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ آگے آگے رضیہ تھیں جبکہ

ان کے پیچھے سیاہ برقعے اور نقاب میں ملبوس ایمان۔ کاندھے پر وہی سیاہ چمڑے کا بستہ لٹکا رکھا تھا۔ صحن میں چار پائیوں پر تقریبا آٹھ دس مرد سو رہے تھے۔ ایمان کو اپنا سانس حلق میں اٹکتا محسوس ہو رہا تھا۔

اگر ابھی اسی لمحہ اچانک سے ان میں سے کوئی اٹھ گیا تو؟ وہ اس سے آگے سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ جھر جھری لے کر وہ آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ دروازے تک پہنچ کر رضیہ بیگم کنڈی کھولنے لگیں تو کنڈی کے کھلنے کی آواز وہاں گونجنے لگی۔

"اماں۔۔۔ آواز سے اٹھ جائیں گے سب۔"، اس نے ان کا شانہ ہلاتے ہوئے پریشانی سے کہا تو رضیہ سر جھٹک کر ہنس دیں۔

"نہیں اٹھیں گے یہ لوگ۔ بھنگ پی کر سوئے ہیں۔"، وہ بولیں تو ایمان کچھ نا سمجھی اور کنفیوژن سے انہیں دیکھنے لگی، جنہوں نے اب کنڈی پوری طرح سے کھول دی تھی۔

"ارے نیند کی دوائی ڈالی تھی ان سب کی چائے میں، میں نے رات میں۔ گھر میں تمہارے اور میرے سوا کوئی جاگا ہوا نہیں ہے، اور نہ جاگ سکتا ہے، سمجھی؟"، دروازہ پوری طرح سے وا کر

www.novelsclubb.com

کے انہوں نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا تھا جس نے ان کی بات پہ سکھ کا سانس لیا تھا۔ پھر ایک نظر سر موڑ کر اپنے گھر پہ ڈالی تھی۔

یہی وہ گھر تھا جہاں اس نے اپنی پوری زندگی گزاری تھی۔ یہاں سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ بہن بھائیوں کے ساتھ کی گئی مستیاں اور شرارتیں، امّاں کو تنگ کرنا اور پھر ان کی ڈانٹیں سننا، آدم بھائی سے ڈر کر چپکے سے ایک دوسرے کو مارنا، تنگ کرنا۔۔۔اور پھر۔۔۔

ہاہ! پھر ابّا کی دھتکار سہنا، ان کے طعنے سننا، ان کی زبان کی کڑواہٹ کو برداشت کرنا، ان کی باتوں پر راتوں کو چھت پر جا کر رونا، فجر میں چھت پر جا کر اللہ سے باتیں کرنا، چھت کی پچھلی منڈیر پر ہاتھ رکھ کر ارتضی مراد سے باتیں کرنا، اسے اپنا حال سنانا۔۔۔اس نے ایک طویل سانس فضا کے سپرد کر کے دھندلاتی آنکھیں پھیر کر اپنے سامنے کھڑی رضیہ بیگم کو دیکھا تھا۔

وہ بھی نم آنکھیں لیے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایمان نے آگے بڑھ کر یکدم ہی انہیں گلے لگایا تھا۔ اس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرتیں وہ بھی نم آنکھوں سے دھیرے سے مسکرادی تھیں۔

"تمہاری ماں اب تمہارے ساتھ ہے، ایمان۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں گھر سے نکال رہی ہوں۔ میں تمہیں گھر سے نکال نہیں رہی ہوں۔ حالات قابو میں آتے ہی میں تمہیں واپس بلا لوں گی۔۔۔ ٹھیک ہے؟"، وہ نرم سی محبت بھری شفقت سے کہتی جا رہی تھیں اور وہ مسکراتے ہوئے سمجھ کر سر اثبات میں ہلاتی جا رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دینا، امّاں۔ اور میرے لیے بہت دعا کرنا کہ اللہ میرا حامی و ناصر ہمیشہ رہے۔ اپنا بھی بہت خیال رکھنا۔ ابّا سے ڈر نا مت اب۔"، وہ بھی یونہی ان کے گلے سے لگی بولی تو وہ پھر سے مسکرا دیں۔ پھر اس سے الگ ہوتے ہوئے انہوں نے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"اپنا بہت خیال رکھنا، ایمان۔ اپنا ایمان مضبوط رکھنا۔ اللہ سے رجوع کرنا۔ میرے لیے بھی دعا کرنا۔ خدا حافظ۔"، وہ نم آنکھوں سے بولیں تو وہ بھی ایک آخری بار ان سے گلے لگ کر آگے بڑھ گئی۔ گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکنیں عجیب بے ہنگم سی ہو رہی تھیں۔

سب یادیں، سب احساسات گڈ مڈ ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ باہر نکلی تو سامنے ہی پول کے

ساتھ ٹیک لگائے، سینے پہ بازو لپیٹے، وہ سنجیدہ سا کھڑا تھا۔اسے آتا دیکھ کر ٹیک ہٹاتا، فوراً ہی آگے بڑھ آیا تھا۔

مڑ کر ایمان نے ایک آخری بار رضیہ بیگم کو دیکھ کر خدا حافظ کہا تھا اور آگے بڑھ آئی تھی۔رضیہ بیگم نے بھی دروازہ بند کر دیا تھا۔

"السلام علیکم ایمان۔"، روحان نے اس کے قریب جا کر پیچھے بندھے ہاتھ ہٹا کر سیدھا ہوتے ہوئے اسے کہا تو وہ خالی خالی نگاہیں اٹھائے اسے دیکھنے لگی۔

"میں آپ کو کیا کہوں؟"، وہ یکدم ہی نجانے کیوں شرمندہ سا ہوا تھا۔اس کو اور کوئی طرز تخاطب سمجھ آ ہی نہیں رہا تھا۔ایمان نے نقاب سے جھانکتی آنکھیں پھیر کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔پھر دور گلی کے سرے پر اسے سفید رنگ کی مہران کھڑی نظر آئی تو اس نے روحان کو دیکھا۔

"آپ مجھے ایمان کہہ سکتے ہیں۔"، سنجیدگی سے کہتی وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

وہ اس کی آنکھوں میں پنپتا سوال سمجھ گیا تھا جبھی گاڑی کی جانب اشارہ کیا۔

"گاڑی میں چلیں گے۔۔۔آیئے۔"، وہ اسی سنجیدگی سے کہتا ہوا آگے بڑھا تو وہ بھی اس کے

پیچھے پیچھے ہی چلنے لگی۔ گاڑی تک پہنچ کر اس نے ایمان کو دیکھتے ہوئے نگاہیں جھکا کر پچھلا دروازہ کھولا تھا۔ وہ چپ چاپ آتی اندر جا بیٹھی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہی تھی۔ روحان بھی چل کر ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھا تھا اور دروازہ بند کر کے پہلا گیئر ڈالا تھا۔

پھر ریس دی تو گاڑی آگے بڑھ گئی۔ حیدر آباد کی چھوٹی موٹی گلیوں سے گزرتی ہوئی گاڑی جب بالآخر مین روڈ پر اتری تو گاڑی کی خاموش پڑی فضا میں روحان کی گھمبیر سی آواز گونجی تھی۔

"وہ دراصل یہ گاڑی حسنہ کی ہے۔"، اس کے کہنے پر کھڑکی کی جانب رخ کر کے بیٹھی ایمان نے چہرہ پھیر کر اسے دیکھا تھا۔

"حسنہ میری بیوی ہے۔۔۔آئی مین، منکوحہ۔"، اس کی آنکھوں میں نظر آتے سوال کا جواب دے کر اس نے توجہ ڈرائیونگ پہ پھر سے مرکوز کر لی تھی۔ ایمان سر ہلاتی پھر سے کھڑکی کی جانب رخ موڑ گئی تھی۔

"حسنہ نے کہا کہ یوں بائیک پر جانا مناسب نہیں ہے، سو میں اس کی گاڑی لے جاؤں۔"، اب

کے اس نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سمجھ کر سر ہلانے لگی۔اس کے بعد گاڑی میں گہری خاموشی چھا گئی۔رات کے اس پہر سڑکیں خالی تو نہیں تھیں، بائیکیں اور گاڑیاں اکادکا نظر آتی تھیں۔زیادہ تر دکانیں بھی بند ہو چکی تھیں۔

گاڑی کا شیشہ کھول کر وہ سر کھڑکی کی سل پر رکھے، سیاہ آنکھوں سے وسیع سے پھیلے آسمان کو تک رہی تھی۔روحان اس کے لیے انجان تو نہ تھا،البتہ واسطہ کبھی اتنا پڑا ہی نہیں تھا اس کی فیملی سے۔ہاں یہ وہ جانتی تھی کہ روحان ارتضی کا بچپن کا ساتھی اور دوست ہے۔اور بچپن کے کچھ دن بھی اسے یاد تھے۔

اور گھر پہ بھی جب اماں نے اسے یہ بتایا کہ روحان ارتضی کے کہنے پر اس کا خیال رکھے گا اور اس کی مدد کرے گا، تو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہلکے پھلکے سے واہمے بھی مٹ کر رہ گئے تھے۔وہ جانتی تھی کہ ارتضی مراد اسے ایسے ہی کسی کے آسرے نہیں چھوڑے گا۔اگر اس نے اسے روحان کی حفاظت میں سونپا تھا، تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی سونپا تھا۔وہ مطمئن تھی۔اور یہی بات روحان کو بھی مطمئن کر رہی تھی۔

وہ کسی بھی طریقے سے اسے ان کمفرٹیبل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

غزل رمیص کے گھر میں اس وقت تاریک وسن سی خاموشی چھائی تھی۔ وہ لوگ سو گئے تھے شاید تبھی کوئی نظر نہ آتا تھا۔ لاؤنج کی دیوار پہ نصب بڑی سی بغیر ڈائل والی گھڑی کی چمکتی سوئیاں اس وقت ایک بجا رہی تھیں۔ ہر سو گہری خاموشی کا راج تھا۔

ایسے میں غزل کے کمرے میں جھانکا جاتا تو وہ ہمیشہ کی طرح کروٹیں بدلتی نظر آتی۔ ہلکی غنودگی میں لیٹی وہ بے چین دکھتی تھی۔ جبھی اچانک ہی پٹ سے اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ کچھ سیدھی ہو کر لیٹ کر اوپر چھت کو تکنے لگی۔ یادیں سکون کا سانس لینے دیتی ہی کہاں تھی؟

اس کی ویران آنکھوں میں نمی امڈ کر آنے لگی تھی۔ لب خود بخود آپس میں پیوست ہونے لگے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ گویا کوئی زوروں سے اس کا دل بھینچ کر جھنجھوڑ رہا ہو۔ اسے تکلیف اور اذیت پہنچا رہا ہو۔ آنکھوں کی نمی پانی کی صورت اختیار کرتی بھل بھل رخساروں پر بہنے لگی

تھی۔ چہرہ دہکتا محسوس ہو رہا تھا۔

ذہن کے پردے پر کسی کا ہنستا مسکراتا چہرہ لہرایا تو تکلیف اور درد حد سے سوا ہوتا محسوس ہوا۔ حلق میں درد بڑھتا محسوس ہوا تھا۔

چند سال قبل۔۔۔

منظر ایک روشن صبح کا ہے۔ آسمان پر سفید روئی جیسے بادل بہتے نہایت حسین لگ رہے تھے۔ ہر جانب پرندے چہچہاتے ہوئے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ایسے میں "پاکستان نیوز" کی بلند و بالا عمارت کے شیشے کے داخلی دروازے کو پار کرتی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔

سیاہ کھلے سے عبائے کے ساتھ سیاہ نقاب کیے، کہنی پہ سیاہ ہی پرس لٹکائے، وہ سیاہ ہیل میں مقید پاؤں سنگ مرمر کے فرش پر دھرتی آگے آگے ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ نقاب سے جھانکتی ہیزل آنکھوں میں کئی خواب اور کئی جگنو رقصاں تھے۔ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

وہ چلتی ہوئی جا کر دائیں جانب بنی لفٹ کے انتظار میں کھڑی ہو گئی تھی۔ لفٹ جو نہی نیچے آ کر

www.novelsclubb.com

ٹھہری، اس کے سلور رنگ کے دروازے جدا ہوئے اور دو لوگ لفٹ سے باہر نکلے۔ ان کے نکلتے ہی غزل نے قدم اندر بڑھائے۔ ابھی وہ لفٹ کا بٹن پریس کرنے ہی والی تھی کہ سامنے سے اسے وہ اسی جانب، لفٹ کی طرف آتا نظر آیا تھا۔ سیاہ ڈریس شرٹ کے ساتھ سیاہ ہی پینٹ پہنے، وہ تیزی سے دوڑتا ہوا، ہاتھ میں ایک سیاہ فائل تھامے اندر داخل ہوا تھا۔

غزل بے ساختہ ہی ایک جانب کو کھسک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اب کے وہ آرام سے آگے بڑھ کر لفٹ کا بٹن پریس کرنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ غزل اسے کچھ کہہ کر ٹوکتی، اس نے دیکھا کہ وہ بھی اسی فلور پر جا رہا تھا جس پر وہ جا رہی تھی۔ چپ کر کے وہ ایک جانب نگاہیں جھکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ مصروف سے انداز میں اب کے اپنے ہاتھ میں تھامی فائل کھول کر اس میں سے کچھ پڑھنے لگا تھا۔ سپید و سنہری سا چہرہ سنجیدہ دکھتا تھا۔ جبھی اچانک ہی کسی احساس کے تحت اس نے چہرہ فائل پر سے اٹھا کر گردن ہلکی سی موڑ کر اسے دیکھا جو سینے پہ بازو لپیٹے، رخ موڑے کھڑی تھی۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے پہچاننے میں اور اگلے ہی پل رمیص کے لب بے اختیار ہی ایک نرم سی مسکراہٹ

میں ڈھلے تھے۔

"ہیئے مس غزل ارشد۔"،اس نے مسکرا کر گھمبیر تا سے اسے مخاطب کیا تو غزل نے چہرہ ہلکا سا اس کی جانب موڑ کر ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی اور پھر رخ موڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"السلام علیکم۔"

رمیص کی مسکراہٹ بے اختیار مزید گہری ہوئی تھی۔لبوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی اور سمجھ کر سر ہلاتے ہوئے چہرہ سیدھ میں کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔"

وہ سر ہلا کر گویا اس کا "وعلیکم السلام" قبول کر رہی تھی۔رمیص مزید مسکرایا تھا۔

"آپ کا فرسٹ ڈے ہے آج؟"،اب کچھ تو پوچھنا تھا۔۔۔گفتگو کا آغاز تو کرنا تھا سو یہ سوال ہی کر ڈالا۔غزل نے چہرہ ہنوز اگلی جانب موڑے ہی دھیرے سے جواب دیا تھا۔

"نہیں۔کل تھا فرسٹ ڈے۔"،رمیص کے لب بے اختیار ہی اوہ میں ڈھلے تھے۔وہ سمجھ کر

سر ہلانے لگا۔ایک بار پھر دونوں کے درمیان عجیب سی خاموشی حائل ہو گئی تھی۔رمیص کو کچھ آکورڈ سا لگ رہا تھا، سو ایک بار پھر زبان پھسلی۔

"میں کل نہیں آیا تھا ناں۔۔۔تو شاید جبھی آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔"

"ہوں۔"، وہاں مکمل نظر اندازی تھی۔۔۔مکمل اگنور۔رمیص کو عجیب سا لگ رہا تھا۔اسے اس طرح آج سے پہلے کسی نے اگنور نہیں کیا تھا۔اتنا روکھا رویہ تو کسی لڑکی نے آج تک اس کے ساتھ نہیں برتا تھا۔وہ عجیب کشمکش کا شکار بنا وہیں کھڑا تھا۔جبھی لفٹ کے دروازے جدا ہوئے تو غزل نے قدم باہر کی جانب بڑھائے۔

وہ لب کاٹتا اس کے نکلتے ہی لفٹ سے نکل کر اپنے آفس روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔

منظر اب سے کچھ دیر بعد کا ہے۔غزل ہاتھ باندھے مستعد سی کھڑی رؤوف صاحب کی بات سن رہی تھی۔

"آپ شوکی پر ڈکشنز ابھی نہیں کریں گی۔ابھی آپ کو ڈائریکشنز کرنی ہوں گی۔"، وہ اسے دیکھتے

ہوئے کہتے جا رہے تھے اور وہ سمجھ کر سر ہلاتی جا رہی تھی۔ "آپ کو آتی تو ہیں ناڈائریکشنز؟"

غزل نے فوراً سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"میرے پاپا معروف ڈائریکٹر بھی رہ چکے ہیں، سر۔ میں یہاں آنے سے پہلے ان سے یہ کام بھی سیکھ چکی ہوں۔"، وہ مسکرائی تھی۔

"جی وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

جبھی بات کرتے کرتے وہ یکدم ہی ٹھہرے اور کچھ اچھنبے سے اسے دیکھا۔ ان کے ذہن میں جیسے کچھ کلک ہوا تھا۔۔۔ کچھ حیران کن، کچھ بے یقین سا۔

"ویٹ۔۔۔ مس غزل۔۔۔ آپ ارشد صاحب کی بیٹی ہیں؟ ارشد کبیر کی؟ دا گریٹ ارشد کبیر کی؟"، وہ شدید بے یقین تھے۔ غزل نے ہلکا سا مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ شدید بے یقینی میں گھرے اسے منہ کھولے دیکھ رہے تھے۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟"

"بتانے سے کیا ہوتا، سر؟ جاب تو مجھے اپنی محنت سے ملنی تھی نا؟"، وہ نرمی سے بولی تو انہوں نے ہلکا سا مسکرا کر سر ہلایا۔

"مگر مجھے اب بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ میں پہلے کیوں نہ سمجھ سکا۔ آپ کی آنکھیں بالکل اپنے بابا جیسی ہیں۔ بالکل سیم۔"

"میں خود بھی ان کے جیسی ہی ہوں، سر۔"، اس کے کہنے پر وہ مسکرائے تھے۔ ابھی وہ مزید کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اچانک ہی دروازہ دھیرے سے ناک کیا گیا تھا۔

"کم ان۔"، رؤوف صاحب نے کہا تو اگلے ہی پل دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔ غزل نے نگاہیں اس کی جانب سے مکمل پھیر کر رؤوف صاحب کی جانب ہی کر لی تھیں۔

"آؤ رمیص۔۔۔ تمہارے لیے نئی ڈائریکٹر ڈھونڈی ہے میں نے۔"، انہوں نے یکدم ہی مسکرا کر رمیص کو مخاطب کر کے کہا تو غزل کو گویا ایک کرنٹ سا لگا۔ اس نے بے یقینی سے رؤوف صاحب کو دیکھا تھا، جواب اس کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔

"مس غزل ارشد۔ آپ رمیص کے شو کو ڈائریکٹ کریں گی۔ رمیص کے ساتھ آپ کو بہت

کچھ سیکھنے کو بھی ملے گا۔۔۔"، وہ جیسے سب ڈیسائیڈ کیے بیٹھے تھے۔ رمیص شاید یہ بات نہیں جانتا تھا، اسی لیے کچھ کچھ بے یقین وہ بھی تھا۔

"چلیں اب آپ لوگ شو کی تیاری کریں۔ رات آٹھ بجے شو لائیو آن ایئر ہو گا۔"، وہ کہہ کر مسکراتے ہوئے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گئے تو غزل لب بھینچ کر ایک اچٹتی نگاہ ساکت کھڑے رمیص پر ڈالتی، سر جھٹک کر باہر چلی گئی تھی۔ پیچھے اب کے رمیص کے لب ہلکی سی نرم مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔

"اوکے سر۔ بائے۔"، وہ کہہ کر مڑ کر اپنے آفس روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔ آج کے شو کی تیاری مزید محنت سے کرنی ہو گی۔ ظاہر ہے، اب اپنی نئی ہدایت کار سے ڈانٹ تو نہیں سننی تھی نا۔

اسے سوچ سوچ کر ہی پیٹ میں گدگدی ہو رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کیسے کام کرے گی۔ وہ تو ویسے ہی اس سے اتنا چڑتی تھی۔

وہ یونہی متورم دہکتی آنکھوں کے ساتھ افسردگی سے مسکرا دی تھی۔ آنکھوں میں ایک یاسیت،

ایک تڑپ سی تھی۔یوں جیسے اس کے جسم کا کوئی اعضاء اس سے جدا ہو گیا ہو اور اب وہ حصّہ اسے شدید تکلیف میں مبتلا کر رہا ہو۔یوں جیسے طوفان کے ایک جھونکے نے ہی سب تہس نہس کر ڈالا ہو۔اس کی خوشیاں بھی،اس کی خواہشیں بھی۔وہ دن اتنے حسین،اتنے خوبصورت دن تھے کہ بھلائے بھی نہ جاتے تھے۔وہ لمحات اتنے یادگار تھے کہ وہ سوچ سوچ کر بھی نہ تھکتی تھی۔ تبھی ذہن میں ایک اور لمحہ گردش کرنے لگا تھا۔۔۔

اسے رمیص کے ساتھ کام کرتے دو ہفتے گزر چکے تھے اور ان دو ہفتوں میں اس نے جو شے سب سے زیادہ نوٹ کی تھی،وہ یہ تھی کہ وہ بہت سلجھا ہوا سا لڑکا تھا۔جن جن کو جانتا تھا،ان کے ساتھ خوب فرینک تھا۔۔مگر جن کو نہ جانتا ہو،ان کے ساتھ ایک فاصلہ سا بنائے رکھتا تھا۔

مگر نجانے کیوں غزل کو اپنے معاملے میں وہ فاصلہ قائم نہیں نظر آیا تھا۔وہ خود ہی آکر غزل کے ساتھ بیٹھ جاتا،اس سے باتیں کرنے کے موقع تلاشتا،اسے ہنسانے کو جانے کتنے ہی عجیب و غریب سے لطیفے سناتا،جن کے جواب میں وہ محض مسکرا دیتی۔اب اور کیا کرتی بیچاری؟

اس وقت وہ اسٹوڈیو میں کھڑی آج کے مہمان خصوصی سے کچھ بات کرنے میں مصروف تھی جب رمیص اسٹوڈیو کا شیشے کا دروازہ دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ نیوی بلیو رنگ کا پینٹ کوٹ پہنے، ساتھ میں ہم رنگ چمکتے بوٹ پہنے، وہ بال سلیقے سے پیچھے کو جمائے ہوئے تھا۔ چہرہ کافی حد تک سنجیدہ اور سخت ساد کھ رہا تھا۔ غزل نے اپنی بات مکمل کر کے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

نجانے کیوں آج وہ اسے کافی سنجیدہ سا لگا تھا۔ عام طور پر وہ اتنا سنجیدہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ چلتا ہوا جا کر بغیر کسی سے کوئی بھی بات کیے، اپنی راکنگ چیئر پر بیٹھ گیا تھا اور سامنے پڑے پیپرز اٹھا کر پڑھنے لگا تھا۔ کچھ ہچکچا کر غزل نے اس کی جانب قدم بڑھائے تھے جو سر پیپرز پہ جھکائے مکمل طور پر ان کی جانب متوجہ تھا۔

"السلام علیکم مسٹر رمیص۔"، اس کی کچھ محتاط سی آواز و انداز پر رمیص نے یکدم ہی سر اٹھا کر اسے کچھ حیرت سے دیکھا تھا۔ ان دو ہفتوں میں ایک بار بھی غزل نے اسے خود سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ تو اس سے جتنا دور رہ پا رہی تھی، رہ رہی تھی۔ ایسے میں اس کی حیرت تو بنتی تھی۔

"و۔۔وعلیکم السلام۔۔۔"، کہہ کر وہ خاموش سا ہوا، اسے دیکھنے لگا تھا۔یوں جیسے اس کی مزید کسی بات کا منتظر ہو۔غزل ہلکے سے مسکرائی تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟"،اب کے رمیص کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔وہ تو اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی، کہاں یہ کہ اب اس سے اس کی خیریت دریافت کر رہی تھی؟ وہ جتنا حیران ہوتا، کم تھا۔

"ج۔۔۔جی۔میں ٹھیک ہوں۔آپ تو ٹھیک ہیں ناں؟"،اس کا یہ سوال بنتا بھی تھا۔نجانے کیوں غزل یکدم ہی بہت شرمندہ سی ہو گئی تھی۔انگلیاں مروڑتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی خیریت کا بتایا تھا۔رمیص نے اس کی کنفیوژن بغور دیکھی تھی۔

"آپ کو کچھ ہوا ہے کیا؟"،غزل نے اب کے چہرہ اٹھا کر قدرے بہتر انداز میں اس سے پوچھا تو رمیص کی کشادہ پیشانی پر کچھ بل نمودار ہوئے۔۔۔اس کے اندر تلخی کا ایک لاوا ابھاٹا تھا جو پھٹنے کو تیار بیٹھا تھا۔۔۔مگر اس وقت کن مشکلوں سے اس نے اپنے اشتعال پر قابو پایا تھا، یہ صرف وہی جانتا تھا۔بہت ہی صبر اور ضبط سے اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"جی نہیں۔کچھ نہیں ہوا۔"،وہ کمال ضبط سے بولا تھا۔"کیوں ؟آپ کیوں پوچھ رہی ہیں ویسے ؟"

"نہیں۔۔۔وہ تو آپ کا موڈ خراب لگ رہا تھا ناں، جبھی پوچھنے چلی آئی۔مجھے لگا کہ شاید کچھ ہوا ہو۔۔۔خیر،ایوری تھنگ از ڈن۔کچھ ہی دیر میں ہم لائیو جائیں گے۔"،اس نے کمال مہارت سے موضوع پلٹ کر اسے ایک نظر دیکھا،اور پھر مڑ کر اپنے ٹھکانے پر چلی گئی۔رمیس کی نظروں نے اس کا آخر تک تعاقب کیا تھا۔جوں ہی وہ مڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھی،رمیس نے نگاہیں پھیر کر آج کے مہمان کو دیکھا۔کچھ پلوں پہلے غائب ہوئے بل ایک بار پھر نمودار ہونے لگے تھے۔

اس کی آنکھوں میں تپش در آئی تھی۔لب خود بخود آپس میں سختی سے پیوست ہو گئے تھے۔ چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔مہمان نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈال کر اپنے شانے اکڑائے تھے۔وہ ملک کے نامور سیاست دانوں میں سے ایک،صوبہ پنجاب کے چیف منسٹر تھے۔ان کی آنکھوں میں جھلکتا تکبر اور غرور رمیص کے اندر باہر ایک آگ لگا گیا تھا۔

www.novelsclubb.com

"ان سے یہ سوالات پوچھنے ہیں۔"،اس کے سینیئر افسر، جمال صاحب نے ابھی چند منٹوں پہلے اسے اپنے آفس میں بلا کر اس سے یہ کہا تھا اور اسے ایک فہرست تھمائی تھی جس میں وہ سوالات تھے، جو مہمان سے کرنے تھے۔اس نے اس سختی سے لب بھینچے تھے کہ خون چھلکتا محسوس ہوا تھا۔ مہمان کمال بے نیازی سے اس کے اشتعال کو نظرانداز کیے ہوئے تھا۔

"وی آر گوئنگ لائیو ان ٹین سیکنڈز۔بی ریڈی۔"، جبھی غزل کی باور کرواتی جتاتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے نگاہیں پھیر کر اسے ایک بار پھر دیکھا۔

"اسٹارٹ۔"،اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ رمیص جہانزیب اپنی فورم میں لوٹ آیا تھا۔ نہایت مستعدی سے اس نے اپنے سامنے پڑا پرچہ الٹا کر کیمرے کی آنکھ میں دیکھا تھا اور شروع ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم ناظرین۔دی ہاٹ ایوننگ کے ساتھ میں ہوں آپ کا میزبان، رمیص جہانزیب۔۔۔آج کے شو میں آپ کو خوش آمدید کرتا ہوں۔"، وہ بولتا جا رہا تھا اور اس کا مہمان خاصی پر تکلفی سے اس کو دیکھتا جا رہا تھا۔ کون کہتا ہے کہ پیسہ سب کچھ نہیں خرید سکتا؟ دیکھ تو،

آج اس نے ملک کے سب سے نامور صحافی کو بھی اسی پیسے سے خرید لیا تھا۔

یہ سب ڈھونگ ہی ہوتے ہیں ایمانداری کے۔آج کل کے زمانے میں کوئی ایماندار ہونا افورڈ نہیں کر سکتا۔اس کی آنکھیں اس کے ذہن میں چلتے خیالات کو صاف عیاں کر رہی تھیں۔اس کی آنکھوں میں تحقیر تھی۔غرور تھا!سب کچھ حاصل کر لینے کا غرور۔

"آج ہمارے ساتھ چیف منسٹر آف پنجاب،ذوالفقار بٹ صاحب موجود ہیں۔۔۔السلام علیکم ذوالفقار صاحب۔کیسے ہیں آپ؟"،اس نے اپنے ازلی مستعد سے انداز میں ان سے سوال کیا تو وہ مسکرائے۔پھر اپنی جگہ پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کروفر سے کہا۔

"وعلیکم السلام رمیس صاحب۔میں الحمداللہ بالکل ٹھیک ہوں۔اللہ کا کرم۔"

شو آگے بڑھتا جا رہا تھا۔سوالات ہوتے جا رہے تھے۔ذوالفقار صاحب نہایت آرام دہ سے انداز میں بیٹھے اس کے سوالات کا جواب ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ دے رہے تھے۔انہیں جیسے اپنے انداز پر خوب فخر اور غرور تھا۔جبھی ایک بریک کا وقت آیا تو کیمرا ز پاز کیے گئے۔جوں

ہی کیمرا زپاز ہوئے، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زوالفقار صاحب اپنے بال وغیرہ سیٹ کروانے کے لیے اکڑے بیٹھے تھے۔ رمیض چلتا ہوا سیدھا واش روم گیا تھا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"ایماندار بننا بہت آسان ہوتا ہے۔۔۔ مگر ایماندار رہنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔"، اس کے ذہن میں اپنے ہی کہے گئے الفاظ گونجنے لگے تھے۔ اس نے ضبط سے آنکھیں بند کر کے کھولی تھیں۔ اس کو اپنے ایماندار ہونے پر غرور نہیں تھا۔ البتہ فخر ضرور تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے اکثر ہی یہ بات کہتا رہتا تھا۔

آج اسے یہی بات اپنے منہ پر طمانچے کی طرح پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ آج تک ایماندار رہنے والا رمیض جہانزیب کیا اتنا بے ایمان تھا کہ ذرا سے پریشر کے آگے ہار مان گیا؟ کیا اس کا ایمان اتنا سستا تھا کہ یوں چند پیسوں کے آگے بک جائے؟ کیا وہ اتنا گرا ہوا تھا؟

"وی آر گوئنگ لائیو ان ففٹین سیکنڈز۔"، باہر سے غزل کی آواز گونجی تو وہ جیسے اپنے حواسوں

میں آیا۔ایک گہرا سانس لے کر اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا تھا۔فیصلہ ہو چکا تھا۔وہ ایمان پر ثابت قدم رہنے والا تھا۔وہ بکنے والا نہیں تھا۔اس کا ایمان اتنا سستا نہیں تھا کہ ان دنیاوی ناسوروں کے ہاتھوں بک جائے۔وہ رمیص جہانزیب تھا۔۔۔وہ رمیص جہانزیب جو ایماندار بنا نہیں تھا، ہوا تھا۔۔۔اور ابھی بھی تھا!

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور آکر اپنی سیٹ پر پھر سے بیٹھ گیا تھا۔اب کے اس کا انداز، اس کی چال، اس کی شان و تمکنت پہلے جیسی تھی۔ گردن اسی ناز سے اٹھی ہوئی تھی۔آنکھیں اسی طرح چمک رہی تھیں جیسے چمکا کرتی تھیں۔

"ویلکم بیک ناظرین۔۔۔اب بڑھتے ہیں اپنے اگلے سیشن کی جانب جس کا آپ سب سمیت مجھے بھی بہت بے صبری سے انتظار تھا۔"، کہتے ہوئے اس نے ذوالفقار صاحب کو دیکھا تھا جو اب بھی ویسے ہی مسکرا رہے تھے۔

"جی تو سی ایم صاحب۔۔۔میرا پہلا سوال یہ ہے کہ پچھلے سال ہونے والے الیکشنز میں آپ کو پنجاب کا سی ایم منتخب کیا گیا۔آپ نے الیکشن کے وقت ایک اعلان کیا تھا۔۔۔اور وہ اعلان یہ تھا

کہ آپ پنجاب کے گاؤں میں لڑکیوں کے لیے چند کالجز کی تعمیرات کروائیں گے۔۔۔"، وہ کہتا جارہا تھا اور زوالفقار صاحب اب بھی ہنوز اسی انداز میں مسکراتے جا رہے تھے۔۔۔ ہاں یہ انہی کا دیا ہوا سوال ہی تو تھا۔ وہ مطمئن تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ پیسہ ایمان بھی خرید سکتا ہے۔

"مگر ہماری اطلاعات کے مطابق پچھلے برس سے لے کر اب تک پنجاب کے کسی بھی گاؤں میں کوئی بھی کالج بننا شروع نہیں ہوا ہے۔۔۔ اس بارے میں کیا کہیں گے آپ؟"، رمیص سنجیدگی سے پیپر ہاتھ میں تھامے انہیں دیکھتا جارہا تھا جن کے چہرے کا رنگ پوری طرح نچڑ گیا تھا۔ یہ ان کا دیا ہوا سوال تو ہرگز نہ تھا۔ انہوں نے بے ساختہ ہی چہرہ پھیر کر دور کھڑے اپنے پی اے کو دیکھا تھا، جس کی رنگت بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھی۔ وہ بھی ان ہی کے جتنا حیران تھا۔

"زوالفقار صاحب۔۔۔"، رمیص نے ان کی چپ پر خاصا جتا کر ان کا نام ایک بار پھر دہرایا تھا۔ زوالفقار صاحب نے بمشکل اس کو دیکھ کر تھوک نگلا تھا۔ ان کے لب بھینچتے چلے گئے تھے۔ جبھی رمیص کے کان میں غزل کی آواز گونجی تھی۔

"رمیص۔۔۔ جمال سر کہہ رہے ہیں کہ یہ سوال مت پوچھئے۔"، اس کی خود کی آواز میں بھی

نا سمجھی تھی۔یوں جیسے اسے بھی سمجھ نہ آیا ہو کہ وہ یہ سوال کیوں نہ پوچھے۔اس طرح کے سوال تو وہ روز ہی شو میں پوچھا کرتا تھا،تو آج کون سی الگ بات تھی؟رمیص کے لب بھینچے تھے۔اگلے ہی پل اس نے اپنے سامنے پڑا پرچہ اٹھا کر کیمرے کے سامنے کیا تھا۔

اپنے روم میں بیٹھے جمال صاحب کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔ذوالفقار صاحب کی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔یہ شو لائیو آن ایئر نہ ہو رہا ہوتا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر بیٹھتے۔خود پر کڑے پہر بٹھا کر انہوں نے حراساں نظروں سے رمیص کے ہاتھ میں تھامے پرچے کو دیکھا تھا۔

"رمیص جہانزیب کا ایمان اتنا سستا نہیں کہ آپ جیسے لوگ اسے خرید سکیں۔"،وہ کیمرے میں دیکھتا ہوا اپنے ازلی شاندار انداز میں کہتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی پرچہ بھی پھاڑتا جا رہا تھا۔اس نے اتنی دیر تو وہ پرچہ کیمرے کے سامنے رکھا تھا کہ کافی سارے لوگ اسے باآسانی پڑھ چکے تھے۔

ذوالفقار صاحب کا اشتعال کے مارے برا حال تھا۔وہ بپھر کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"سوئچ آف دی کیمراز،غزل۔"،جمال صاحب نے غصّے سے غزل کو ایئر پیس پہ کہا تھا اور اپنے

روم سے نکل گئے تھے۔

"لعنتی انسان۔۔۔ تمہیں چھوڑوں گا نہیں میں۔"، سی ایم صاحب نہایت بدلحاظی اور تنفر سے بلند آواز میں اس سے کہہ رہے تھے، جو بازو سینے پہ لپیٹے، انہیں اسی طرح دیکھ رہا تھا۔

"ہم میں سے کون زیادہ لعنتی ہے، یہ تو ہماری عوام ہی آپ کو بتائے گی۔"، وہ اتنی پر اعتمادی سے بولا تھا کہ زوالفقار صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ بپھر کر اس کے قریب آئے تھے اور اس کا گریبان مٹھی میں دبوچا تھا۔ ان کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو، لعنتی (گالی) انسان؟"، سی ایم پنجاب دھاڑا تھا جس پر رمیص کے جبڑے کی رگیں بری طرح تنی تھیں۔ پیشانی پر بھی ایک رگ ابھرتی دکھی تھی۔ اگلے ہی پل اس نے سی ایم کا ہاتھ بری طرح جھٹک کر اپنے گریبان سے ہٹایا تھا اور جھک کر اس کے قریب ہوا تھا۔

"اپنے لعنتی ذہن میں یہ بات بٹھا لو کہ میں رمیص جہانزیب ہوں۔۔۔ تمہاری طرح بے غیرت نہیں۔ سمجھے؟"، رمیص جہانزیب یوں تو بڑا کالم سا تھا۔۔۔ مگر غزل نے آج اسے پہلی بار بڑی بری طرح غرّاتے دیکھا تھا۔ اس کی آواز بلند تھی۔۔۔ بہت بلند! اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا

تھا۔ کان بھی لال ہو گئے تھے۔

"تمہیں تو میں کتّے کی موت مرواؤں گا۔"، سی ایم زہر اگلتا جا رہا تھا جس پر رمیص نے خوب ہنس کر تین تالیاں بجائی تھیں۔

"دیکھو تو۔۔۔ ایک کتّا کہہ رہا ہے کہ مجھے کتّے کی موت مروائے گا۔۔۔ او کے۔ ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ گو اہیڈ۔"، اس کے انداز میں ایسی بے خوفی تھی کہ اس پل غزل ارشد کو اپنا دل اس کی جانب لپکتا محسوس ہوا تھا۔ اسے ایسی بے خوفی اور نڈر پن ہی تو فیسینیٹ کرتا تھا۔ رمیص جہانزیب آج سے اس کا فیورٹ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اس سوچ پر یکدم ہی خود سے شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ کیا کیا سوچ رہی تھی وہ۔۔۔ اففف!

www.novelsclubb.com

"ملون انسان۔۔۔ چھوڑوں گا نہیں میں تمہیں۔"، سی ایم صاحب ایک بار پھر بپھر کر دھاڑے تھے۔ ان کی آواز بہت زیادہ بلند تھی۔ ٹھیک اسی لمحہ جمال شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات حد درجہ تنے ہوئے تھے۔ وہ شدید غصّے میں لگتا تھا۔

"رمیص!"، وہ آتے کے ساتھ ہی اس پر دھاڑا تھا جس پر رمیص نے ایک گہرا بیزار سانس

خارج کیا تھا اور اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

"دیکھئے جمال صاحب۔ آپ کو کوئی حق حاصل نہیں مجھ پر اس طرح چیخنے چلانے کا۔ اسی لیے اپنی آواز دھیمی رکھئے۔"، وہ ٹھنڈے ٹھار انداز میں بے نیازی سے بولا تھا۔ اس کے چہرے سے اکتاہٹ اب کے واضح جھلکنے لگی تھی۔

"بی ان یور لمٹس، رمیص۔"، جمال ایک بار دھاڑا تھا۔

"یو ٹو۔"، کیا کمال بے نیازی تھی۔ کیا انداز بے خوفی تھا۔ جمال کی گردن کی رگیں بری طرح تن گئی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جا کر ابھی کے ابھی رمیص کے سر میں گولیاں اتار آئے۔۔۔ مگر وہ خود پر بمشکل ضبط کیے کھڑا رہا تھا۔

"جمال۔ آج تم نے میری بہت سبکی کروائی ہے۔۔۔ تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گا۔۔۔ اور تم۔۔۔"، ذوالفقار نے خاصے غصّے سے جمال سے کہنے کے بعد رمیص کو مخاطب کیا تھا۔ ان کی آنکھیں مارے توہین کے سرخ پڑ رہی تھیں۔ "تم اب بچنے کی کوشش کرنا مجھ سے، (گالی)۔۔۔"

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

سی ایم کا یہ کہنا ہی تھا کہ رمیص کا صبر جواب دے گیا۔اب اس کی برداشت سے باہر تھا۔اسے سب برداشت تھا سوائے گالی کے۔۔۔وہ ایک ہی جست میں زوالفقار صاحب کے قریب آیا تھا اوران کا گریبان زوروں سے مٹھی میں جکڑا تھا۔ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

"میں تمہیں۔۔۔"، کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کا مکا بنا کر ابھی فضا میں بلند کیا ہی تھا کہ سب کے منہ سے بے ساختہ ہی چیخیں گونجی تھیں۔اس کا مکا سی ایم صاحب کے منہ کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ کسی کے نرم و دبیز ہاتھ نے اس کا ہاتھ بیچ راستے میں ہی پکڑ لیا تھا۔رمیص کی نگاہیں بے ساختہ ہی اس کی جانب پھری تھیں جو اس کے بالکل قریب کھڑی اسے منّت بھرے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

"لیو ہم،رمیص۔"

اور نجانے رمیص جہانزیب کے دل میں اس وقت کیا آیا تھا کہ اس کا ہاتھ بیچ راستے میں ہی رک

گیا تھا۔ آنکھیں ان ہیزل رنگ کی آنکھوں پہ اٹک کر رہ گئی تھیں۔ یوں جیسے ساری دنیا پس منظر میں چلی گئی ہو۔ یوں جیسے دنیا میں ان آنکھوں کے علاوہ کچھ بچا ہی نہ ہو۔ رمیص جہانزیب اس ایک لمحہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

یہ بھی کہ اس کا پارہ بہت ہائی ہوا ہوا تھا۔ یہ بھی کہ اس نے کسی کا گریبان جکڑ رکھا تھا۔ یہ بھی کہ وہ خود کہاں کھڑا ہے۔۔۔ بس رہ گئی تھیں تو وہ دو آنکھیں۔ وہ منت کرتی نم آنکھیں۔

رمیص جہانزیب کو اس لمحہ اپنا دل غیر معمولی طور پر تیز دھڑکتا محسوس ہوا تھا۔ دھڑکنیں اسے کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

"چھوڑو۔"، جبھی ذوالفقار صاحب نے نخوت سے اس کا ہاتھ اپنے گریبان سے جھٹکا تو وہ جیسے اپنے ہوش میں واپس آیا۔ ان چند پلوں کے لیے وہ شاید واقعی کسی اور دنیا میں کھو گیا تھا۔ سب ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ جمال سی ایم صاحب کو لے کر وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ اب تک وہیں کھڑا تھا۔

اور وہ بھی۔۔۔ہاں، وہی ہیزل رنگ آنکھوں والی پیاری سی لڑکی جس کا چہرہ رمیص جہانزیب نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔۔۔ مگر اس لمحہ اسے واضح طور پر اپنا دل غزل ارشد کی جانب مائل ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"چھوڑدیں آپ انہیں۔۔۔آپ رؤوف سر سے بات کیجیئے۔"، وہ اپنی دانست میں نرمی سے سمجھانے کے سے انداز میں نجانے کیا کیا کہتی جارہی تھی اور وہ بالکل ساکت سا کھڑا اسے دیکھتا جا رہا تھا۔اسے آج سے پہلے کبھی ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔

یہ احساس نیا تھا۔۔۔یہ جذبہ غیر شناسا تھا۔

اس غیر شناسا دنیا میں رمیص جہانزیب کو پہلی بار کوئی شناسا لگا تھا۔۔۔آج رمیص جہانزیب اپنا دل اس لڑکی پر ہار بیٹھا تھا۔اس نے اس لمحے خود سے یہ اعتراف کیا تھا۔دل کی دنیا یکدم ہی اس اعتراف سے بدل کر رہ گئی تھی۔سب ٹھہر گیا تھا۔۔۔اس کی نگاہیں بھی اس لڑکی پر ہی ٹھہر گئی تھیں۔اور اس کا مچلتا دل بھی اس لڑکی پر ٹھہر کر رہ گیا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"رمیص جہانزیب۔۔۔میں تمہیں بھولتی کیوں نہیں؟"، وہ خود سے بڑبڑائی تھی۔اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ مکمل طور پر گیلا ہو چکا تھا۔آنسو اب بھی رکے کہاں تھے؟

ماضی کے پردے چھٹنے لگے تو اس کا ذہن بھی نیند کی وادیوں میں اترنے لگا۔ نجانے کب اس کی آنکھ لگی اور وہ سو گئی۔ باہر رات ویسے ہی قطرہ قطرہ بیت رہی تھی۔

☆☆☆

سفر خاموشی سے گزرتا جا رہا تھا، جب اچانک ہی ایک پٹرول پمپ پر روحان نے گاڑی روکی تھی۔اور پھر کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس نے آدمی کی جانب پانچ سو روپے کا نوٹ بڑھایا تھا۔

"پانچ سو کا ڈال دو پٹرول۔"،اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ آدمی بھی اس کے ہاتھ سے نوٹ تھامتا، پٹرول کے پائپ تک گیا اور اسے اٹھا کر گاڑی کے ٹینک کے منہ پر لگایا۔وہ اس جانب سے کھسک کر تھوڑی پیچھے ہو گئی تھی۔ نگاہیں اب اپنی گود میں دھرے اپنے ہاتھوں پر جمی تھیں۔

روحان اسٹیئرنگ وہیل سے سر ٹکائے، تھکا ہوا سا بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ پھر سے مین روڈ پر موجود تھے۔ گاڑی تیز رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی جب روحان کی آواز گاڑی میں گونجی تھی۔

"میں آپ کو بس اڈّے پر اتاروں گا اور پھر آپ کی سیٹ بک کروا کر آپ کو اپنی نظروں کے سامنے ہی بس میں بٹھا کر چلا جاؤں گا۔"، اس کے کہنے پر ایمان نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ جبھی بولتے بولتے روحان یکدم ہی ٹھہر سا گیا تھا۔ "ویسے آپ رہیں گی کہاں؟"

اور اس نے آخر کار وہ سوال پوچھ ہی ڈالا تھا جو اسے اتنی دیر سے پریشان کیے ہوئے تھا۔ ایمان نے اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد پھر سے کھڑکی کی طرف کھسکتے ہوئے مدھم سی آواز میں جواب دیا تھا۔

"ہمارا ایک گھر ہے کراچی میں۔ ڈیڑھ سال پہلے ہونے والے نانا کی جائیداد کے بٹوارے کے وقت امّاں کے حصّے میں وہ گھر آیا تھا جو امّاں نے زرار بھائی کے نام کر دیا تھا۔ وہیں جاؤں گی ابھی فی الحال تو۔"، اس نے تفصیلی جواب دے کر چہرہ پوری طرح سے کھڑکی کی جانب موڑ لیا تھا۔

باہر سرمئی سڑک کسی تیز رفتار پانی کی دھار کی طرح پیچھے ہی پیچھے بہتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے

نگاہیں اٹھا کر سامنے کی جانب دیکھا تھا۔ سڑک پر اکا دکا ہی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ رات مزید تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان پر جھلملاتے تارے آج اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس لڑکی کا یہ نڈر سا روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ حیرت بھی تھی اور دلچسپی بھی۔

جبھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ روحان نے گاڑی سڑک کی ایک جانب روک دی۔ ایمان نے نگاہیں پھیر کر دائیں جانب والی کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے کئی بسیں کھڑی نظر آئیں۔ وہ بس اڈّے پر پہنچ چکی تھی۔ روحان نے کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے اپنی جانب کا دروازہ کھولا تھا اور باہر نکل کر اس کے لیے بس کا ٹکٹ لینے چلا گیا تھا۔

وہ وہیں خاموش سی بیٹھی بس اڈّے کو دیکھے گئی تھی جہاں باقی کے شہر کی نسبت کافی چہل پہل تھی۔ رات کے اس پہر بھی وہاں کافی لوگ بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ اپنا اپنا ساز و سامان سنبھالے اپنی اپنی بس کے منتظر سے۔ وہ خاموشی سے سب کو تکے گئی تھی۔

"ہیلو بی بی۔"، جبھی اسے اپنے بائیں طرف سے کسی مرد کی آواز آئی تو وہ کرنٹ کھا کر پلٹی اور سامنے دیکھا جہاں دو باوردی پولیس آفیسر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک اس کی کھڑکی پر جھکا

ہوا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والے وہ دونوں ہی اسے بہت خوفناک لگے تھے۔اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔

"کون ہے تمہارے ساتھ؟"، انہوں نے گاڑی کے اندر ایک تفصیلی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تو وہ بمشکل کم پڑتی سانسوں کے درمیان انہیں دیکھتی بولنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

"وہ۔۔۔وہ۔"، الفاظ بن ہی نہیں پارہے تھے۔اس کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔

"وہ، وہ کیا، بی بی؟ بول بھی دو۔"، مونچھوں والے کھڑکی پہ جھکے افسر نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر برہمی سے اس سے کہا تو اس کا سانس تھمنے لگا۔ آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی امڈ آئی تھی۔

"اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگنے کی تیاری ہے، ہاں؟"، انہوں نے بہت ہی غلاظت سے بہت ہی نیچ بات کی تھی۔ ایمان کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔اس کو اپنی زبان پر سو قفل لگے محسوس ہو رہے تھے۔الفاظ حلق کا پھندا بن کر اٹک گئے تھے۔ سانس لینے میں دشواری ہونے لگی تھی۔

"ن۔۔۔ نہیں۔۔۔"، وہ اٹکتے اٹکتے بمشکل بولی تھی جس پر ان دونوں نے پر سوچ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی ہکلاہٹ کو کوئی اور رنگ دے رہے تھے۔ وہی رنگ جو ہمارے معاشرے میں اکثر ہی دیا جاتا ہے۔

"السلام علیکم رئیس صاحب۔"، جبھی پیچھے سے ایک متوازن سی سنجیدہ آواز آئی تو اس کے عین سامنے کھڑا افسر جھٹکے سے مڑا، جہاں سینے پہ بازو لپیٹے روحان یامین کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خطرناک حد تک سنجیدہ تھیں۔ گردن اور جبڑے کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ چہرہ سخت دکھتا تھا۔ ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔

"روحان بیٹے۔۔۔ تم یہاں؟"، وہ حیرانگی سے کہتے ہوئے اس کی جانب بڑھے تو ایمان کا سانس تھوڑا بحال ہوا۔ شکر خدا کا کہ روحان وقت پر آگیا تھا ورنہ وہ تو خوف کے مارے بے ہوش ہی ہو جاتی۔

"خیریت ہے رئیس صاحب؟ آپ میری بہن سے کچھ کہہ رہے تھے؟"، اس نے اسی سنجیدگی سے کہا تو رئیس نامی پولیس والے کی سٹی گم ہوئی۔ اس کے چہرے پر چھائی کچھ دیر پہلے والی

خباثت ایک لمحہ میں عنقا ہوئی تھی۔اس کے پیچھے کھڑا افسر بھی پریشان ہوا تھا۔

"صاحب جی؟"،اس نے پریشانی اور تفکر سے رئیس کا شانہ ہلایا تھا۔

"نہیں بیٹے۔ہم تو ان سے یہی پوچھ رہے تھے کہ وہ کس کے ساتھ آئی ہیں۔۔۔خیر،خداحافظ۔ چلتا ہوں۔خیال رکھنا اپنا بھی اور بہن کا بھی۔"،وہ اس کا شانہ تھپتھپاتا اگلے ہی لمحے تیزی سے اس کے ساتھ سے نکل کر آگے بڑھ گیا تھا۔اس کا ساتھی بھی اس کے ساتھ ہی پیچھے گیا تھا۔

روحان نے ایک اکتاہٹ بھری نظر اس پر ڈال کر قدم گاڑی کی جانب بڑھائے تھے۔چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ اور سپاٹ دکھتا تھا۔

ایمان گہری ہوتی سانسوں کے درمیاں دل تھامے بیٹھی تھی۔اس کا دل ابھی تک بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔آنکھوں میں اضطراب اور پریشانی جھلکتی تھی۔روحان اس کی کھڑکی تک آکر کھڑا ہوا اور ہلکا سا سر جھکا کر اندر جھانکا۔

"ایمان۔"،دھیرے سے پکارا تو اس نے ایک جھٹکے سے سر موڑ کر روحان کو دیکھا جس کے نرم لہجے کے برعکس اس کا چہرہ انتہائی سخت اور سنجیدہ سا لگ رہا تھا۔آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی

سختی پنہاں تھی۔ایمان کو نجانے کیوں ایک دم سے اس سے بہت خوف محسوس ہوا تھا۔

اس لمحہ اسے یہ احساس بہت شدّت سے ہوا تھا کہ اس نے روحان پر بھروسہ کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔چاہے کچھ بھی تھا،وہ تھا تو ایک مرد ہی نا۔اور مرد سے بڑا کوئی جانور شاید ہی کوئی ہو۔ہر مرد ایسا نہیں ہوتا،مگر ایسا ہوتا صرف مرد ہی ہے! ایمان کا حلق تک سوکھ گیا تھا۔الفاظ کہیں اٹکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔وہ بس حواس باختہ نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"ایمان۔۔۔کالم ڈاؤن۔"،وہ شاید اس کی نظروں میں پنہاں خوف بھانپ گیا تھا،جبھی اب کی بار تھوڑی نرمی سے ہولے سے بولا تھا۔لہجے کے برعکس اس کے دماغ میں گویا کئی بجلیاں کڑکی تھیں۔اس کو کچھ بہت برا بھی لگا تھا۔شاید غلط نہ ہونے کے بعد بھی غلط سمجھا جائے تو برا تو لگتا ہی ہے!

"ایمان۔۔۔آپ امانت ہیں۔مجھ سے ڈریئے مت۔"،ہاں شاید غلط نہ ہونے کے باوجود بھی صفائیاں دینا انسان کا دل دکھاتا ہے۔وہ بھی دکھی ہوا تھا۔ایمان کی نظروں کا خوف اب بھی ویسا ہی تھا۔اس لمحہ روحان کو رئیس اور اس کے ساتھی پر بے پناہ غصّہ آیا تھا۔

کچھ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں ہمارے معاشرے میں جن کی وجہ سے اکثریت بدنام ہوتی ہے۔ اس وقت رئیس ان "کچھ" اور روحان "اکثریت" میں شامل حال تھا۔

"ایمان۔۔۔میں نے آپ کو اپنی بہن کہا ہے۔۔۔ابھی نہیں۔۔۔اس وقت بھی جب آپ اکیلی تھیں۔شاید آپ کو یاد نہ ہو مگر مجھے اچھے سے یاد ہے وہ دن۔۔۔وہ وقت۔۔۔وہ لمحہ۔۔۔وہ باتیں۔۔۔اگر میری نیّت میں کھوٹ ہوتا تو پہلے ہی جھلک جاتا۔اگر میری نیّت میں کھوٹ ہوتا تو رضا مجھے کبھی آپ کی ذمے داری نہ سونپتا۔۔۔اگر میں بدنیّت ہوتا تو آپ کو بحفاظت یہاں تک نہ لاتا۔آپ میرا خوف اپنے دل سے نکال دیں۔۔۔یہ لیں۔" نرمی اور سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ٹکٹ اور ایک سلپ اس کی جانب بڑھائی تھی۔ایمان نے ایک نظر اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھامی سلپ کو دیکھا تھا۔اس پر ایمان کا نام اور شہر درج تھا۔وہاں کراچی لکھا تھا۔

محتاط نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر وہ دونوں اشیاء اس کے ہاتھ سے تھام لی تھیں۔اور دوسرے ہاتھ سے بے ساختہ ہی اپنا بستہ تھاما تھا۔اگلے ہی پل روحان نے باہر

سے لاک کھولا تو وہ اسے ایک نظر دیکھتی، اپنا بستہ کاندھے پر لٹکاتی باہر نکل آئی تھی۔اب کے اس نے ایک گہرا طویل سانس خارج کیا تھا۔کچھ دیر پہلے والا خوف تھوڑا زائل ہوا تھا۔وہ شاید واقعی صحیح کہہ رہا تھا۔ایمان نے سیاہ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں، روحان بھائی۔آپ کی نیّت میں کھوٹ نہیں ہے۔آپ سچے ہیں۔آپ بدنیّت نہیں ہیں۔اور ہاں! مجھے یاد ہے وہ دن۔۔۔وہ لمحہ۔۔۔وہ وقت۔۔۔وہ باتیں۔۔۔سب یاد ہے مجھے۔۔۔اس یادگار دن میں نے آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔۔۔آج کر رہی ہوں۔"، اس کی آنکھیں اب کے ہولے سے مسکرائی تھیں۔ان میں نمی بھی ٹھہری تھی۔

"آپ کے ٹکٹ کے پیچھے میرا نمبر بھی درج ہے۔۔آپ اسے اپنے پاس محفوظ رکھئے گا۔جب بھی کبھی آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے، بلا جھجھک مجھ سے رابطہ کر لیجئے گا۔آئی ول بی دیئر فار یو۔"، اسی نرمی سے وہ بولا تھا۔ایمان نے اب کے تھوڑے اطمینان سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

اب وہ اس کو لے کر بس کی جانب بڑھا تھا۔کراچی کی بس ابھی چند منٹوں میں نکلنے ہی والی تھی۔

بس کے قریب، دروازے سے بس کچھ ہی فاصلے پر وہ یکدم ہی رک کر پیچھے روحان کی جانب مڑی تھی جو اس کے پیچھے ہی چلا آرہا تھا۔اسے رکتا دیکھ کر وہ خود بھی رک کر اسے ناسمجھی اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

ایمان کے دل نے اس سے ایک بات کہی تھی۔۔۔اور اگلے ہی پل اس نے یہ الفاظ اپنی زبان سے بھی ادا کر دیئے تھے۔

"رضا کہاں ہے، روحان؟"

روحان کی بھوری آنکھیں ٹھہری تھیں۔ان میں ہلکی سی افسردگی بھری مسکراہٹ جھلکی تھی۔ لب یاسیت سے مسکرائے تھے۔

"لندن میں۔"،اس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ایمان کے دل کی دھڑکنوں نے تیزی پکڑی تھی۔

"کیوں؟"

www.novelsclubb.com

"اس کی مرضی۔"، اس نے شانے اچکائے تھے اور دھیرے سے مسکرایا تھا۔

"یہ لیں۔"، جبھی کچھ یاد آنے پر اچانک ہی روحان نے اپنے ہاتھ میں تھاما ایک شاپر اس کی جانب بڑھایا تو اس نے ایک سوال سا آنکھوں میں لیے اسے دیکھا۔

"یہ حسنہ نے آپ کے لیے دیے ہیں۔"، اب کے وہ بولا تو ایمان کے لبوں پر بے اختیار ہی ایک مسکان در آئی۔ اس نے سر ہولے سے ہلا کر اس کے ہاتھ سے شاپر تھاما تھا۔

"اسے شکریہ کہیے گا۔"، روحان نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ٹیک کیئر، مونی۔"، اس نے دھیرے سے کہا تو ایمان کی آنکھوں میں نمی سی امڈ آئی تھی۔ آج سالوں بعد کسی نے اسے اس نام سے پکارا تھا۔ ذہن کے پردے پر ساری پرانی یادیں تازہ ہوئی تھیں۔ وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔

"سیم ٹو یو، روحان۔"، تکلف کی دیوار بالآخر اتنی دیر بعد گر گئی تھی۔ وہ مسکرائی تھی۔ "خدا حافظ" کہہ کر وہ اگلے ہی پل مڑ کر بس کے زینے چڑھ گئی تھی۔ پیچھے وہ ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

"خدا حافظ۔" اور پھر اس نے ایک نظر اٹھا کر وسیع سے پھیلے آسمان کو دیکھا تھا جس پر سیاہی

پھیلتی جا رہی تھی۔تارے اب تک جھلملاتے ہوئے سب کچھ ملاحظہ کر رہے تھے۔

"رضا کی امانت تیرے حوالے ،اللہ۔"،وہ خود سے بڑبڑایا تھا۔

"آئی ایم شیور کہ تم میرا وعدہ پورا کرو گے ،روحان۔مونی کو تم نے اپنی بہن کہا تھا۔پلیز۔"، رضا کے وہ الفاظ اب بھی جوں کے توں سماعتوں میں گونج رہے تھے۔ایک نم سانس خارج کر کے وہ جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔بس کی شیشے کی کھڑکی سے دو سیاہ آنکھیں اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

مونی والے دن آج پھر سے یاد آئے تھے!

☆☆☆

کراچی پر فجر اتری تو پرندوں نے بھی اپنے آشیانوں سے نکل کر چہچہانا شروع کیا اور اپنے رزق کی تلاش میں ادھر ادھر نکل پڑے۔ایسے میں کراچی کے ایک پوش علاقے میں موجود رمیص جہانزیب کے گھر پر بھی فجر تازہ سی اتری تھی۔وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سر بیڈ کراؤن سے

www.novelsclubb.com

ٹکائے، چھت کو تک رہی تھی۔ایک ہاتھ سے فون کان سے لگا رکھا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ مسلسل ارحم کو تھپک رہی تھی۔

کمرے میں زیرو بلب جلا ہوا تھا جس کی مدھم روشنی سے کمرہ نیم روشن سا ہو رہا تھا۔اے سی کی مدھم سی آواز نے کمرے کی خاموشی میں رس گھولا ہوا تھا۔

"آپ کب تک آئیں گے؟"، خاموشی میں اس کی نرم افسردہ سی آواز گونجی تھی۔اس کی آنکھوں میں بھی افسردگی پھیلی تھی۔

"بیٹے،اچانک ہی بہت اہم میٹنگ آن پڑی ہے جس کے باعث فی الحال چند دنوں تک پلان ملتوی کر دیا ہے۔جوں ہی میٹنگ اور پراجیکٹ سے فارغ ہوتا ہوں، فوراً آجاؤں گا انشاءاللہ۔تم فکر مت کرو۔"، اگلی جانب سے ارشد صاحب بہت ہی تحمل اور نرمی سے بولے تھے۔غزل نے سمجھ کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"اچھا اوکے۔اور سنائیں۔ضوفی کیسی ہے؟"،اس نے اب کے موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا تو اگلی جانب ارشد صاحب نے گویا ایک گہرا سانس لیا۔اب کے جب وہ بولے تو آواز میں

افسردگی اور اداسی محسوس ہوتی تھی۔

"ٹھیک ہی ہے وہ بھی۔"، وہ اداسی سے بولے تھے۔ غزل نے ان کے لہجے میں موجود افسردگی کو فوراً ہی بھانپ لیا تھا۔ وہ کچھ سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا پاپا؟ نصیر بھائی اب بھی ان سے بہتر سلوک نہیں کرتے؟"، اس نے پریشانی سے پوچھا تھا۔ ارشد صاحب کی آنکھوں کی نمی بڑھی تھی۔ ایک تکان زدہ سی سانس خارج کر کے انہوں نے آنکھیں موند کر سر صوفے کی پشت سے ٹکایا تھا۔

"نہیں بیٹے۔ ضوفشاں کا کیا ہو گا، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"، وہ پریشان تھے۔ پریشانی ان کے لہجے اور انداز سے صاف جھلکتی تھی۔

"پاپا، آپ نصیر بھائی سے سیدھا دو ٹوک بات کیوں نہیں کرتے؟ کیوں ضوفی کو سسک سسک کر جینے پر مجبور کر رہے ہیں؟"، وہ بہن کی محبت میں تڑپ اٹھی تھی۔ جانتی تھی کہ بہن چھ سالوں سے یہ رویہ اور یہ سلوک برداشت کر رہی ہے۔ اور کس طرح سے برداشت کر رہی ہے، وہ بھی خوب جانتی تھی۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"بیٹے، میں کیا بات کروں؟ضوفی کا کیا ہو گا پھر؟ کہاں جائے گی وہ؟ میں بھی بیمار رہتا ہوں۔اس کو کون پوچھے گا؟کون دیکھے گا؟"،ان کے دل کی بات زبان پر بے ساختہ ہی آئی تھی۔اور اگلے ہی پل ان کو اس بات کا احساس ہوا تو ٹھہر کر چپ سے ہو گئے۔غزل نے افسوس سے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"اچھا۔۔۔سمجھ آگئی مجھے آپ کی بات۔"،وہ اب کے سمجھ کر سر ہلاتی بولی تھی۔آنکھوں کی تپش بڑھ گئی تھی۔لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔"آپ ذرا یہ بتائیں کہ میری بہن کی زندگی کی اس شخص کے ساتھ رہتے ہوئے کیا گارنٹی ہے؟کسی دن اس شخص نے نفسیات میں آکر میری بہن کا گلا گھونٹ دیا تو ذمّے دار کون ہو گا؟کون پوچھے گا اس ظالم کو؟کون پہنچائے گا اسے اس کے انجام تک؟بولیں!"

"اللہ نہ کرے،غزل۔اللہ ضوفی کو سلامت رکھے۔"،وہ جیسے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولے تھے۔چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

"اللہ تو سلامت رکھتا ہی ہے،پاپا۔مگر یہ انسان۔۔۔ان کا کیا؟"،وہ افسردگی سے سیدھ میں

دیکھتی نم آنکھوں کے ساتھ بول رہی تھی۔ لہجہ میں دکھ اور تکلیف پنہاں تھی۔"آج اگر وہ کوئی قدم اٹھاتی ہے تو کم از کم میں یا آپ تو ہوں گے نا اسے سپورٹ کرنے کے لیے۔ لیکن سوچیں، اگر وہ یہی قدم کچھ سالوں بعد اٹھاتی ہے، تو میری اور آپ کی زندگی کا کیا بھروسہ؟ کیا پتا تب ہم اسے سپورٹ کرنے کے لیے موجود نہ ہوں۔ پھر کیا کرے گی وہ؟ کیسے سنبھالے گی وہ خود کو؟ اپنی بیٹی کو؟ بولیں۔"، وہ پر تپش لہجے میں تکلیف سے بول رہی تھی۔اس کی آنکھوں کی نمی بڑھتی جا رہی تھی۔ چہرہ دہک رہا تھا۔آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

"اللہ سنبھالے گا اسے بھی اور اس کی بیٹی کو بھی۔"، ارشد صاحب دلگرفتگی سے بولے تھے۔

غزل ان کی بات پر یکدم ہی چپ سی ہو گئی تھی۔ کہنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔الفاظ اور بات۔۔۔سب ختم ہو گیا تھا۔

"تم اپنا بتاؤ۔"، اب کے انہوں نے بات کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے کہا تو اس نے آنکھیں میچیں۔ یہی تو وہ نہیں چاہتی تھی۔ خود کو موضوع گفتگو بنتے دیکھنا اسے گوارا نہ تھے۔

"تم خود اپنے ساتھ کیا کر رہی ہو، ہاں؟ اپنے بچوں کو اور خود کو خطرے میں ڈال رہی ہو؟ تمہاری

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

اور اس کی کنڈیشن میں زیادہ فرق نہیں ہے، غزل۔"

"پاپا آپ۔۔۔"

"نہیں غزل، بس! اب بہت ہو گیا۔ تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟ جس کے سامنے رمیص جیسا انسان ٹک نہ سکا، تم کیسے اس کا سامنا کرو گی؟ جو لوگ رمیص کو قبر تک پہنچا گئے، وہ تمہیں بخش دیں گے کیا؟ اپنے باپ کا کچھ خیال کرلو، غزل۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ سب کچھ چھوڑ دو اور میرے پاس آجاؤ یہاں۔"، وہ اب کے بالآخر اس سے پہلی بار اس موضوع پر دو ٹوک بات کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے۔ غزل کا پور پور سلگ رہا تھا۔ کانوں سے جیسے دھواں نکل رہا تھا۔ چہرہ دہک رہا تھا۔ آنکھوں میں اتنی دیر سے جمع ہوئی نمی آنسو بن کر گالوں پر لڑھکنے لگی تھی۔ وہ اب بھی کہے جا رہے تھے۔ "تم میری بیٹی ہو، غزل۔ ارحم میرا نواسہ ہے۔ مجھے عزیز ہو تم دونوں۔"

"اور رمیص؟"، اس کے ان اچانک سے کہے جانے والے الفاظ نے ان کی بات کو بریک لگایا تھا۔ وہ خاموش ہوئے تھے۔ آنکھوں کی تکلیف بڑھی تھی۔ "رمیص کون تھا، پاپا؟ ارحم کون ہے؟

رمیص میرا شوہر تھا اور ارحم میرا بیٹا ہے۔ (اس کا لہجہ آنچ رکھتا تھا۔ تکلیف پورے جسم کو اپنے

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

جکڑ میں لے چکی تھی۔اس کا رواں رواں تکلیف اور اذیت سے جل رہا تھا۔) جیسے آپ کو اپنی اولاد عزیز ہے، ویسے ہی مجھے بھی اپنی اولاد عزیز ہے۔ میرے شوہر نے اپنے بیٹے کو بزدلی نہیں سکھائی۔ بہادری سکھائی ہے۔اس کی رگوں میں رمیص کا خون دوڑتا ہے، پاپا۔ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ یہ سب کرنے والوں کو چھوڑ دے گا؟ وہ اتنا سا ہے پاپا۔ پھر بھی میری ہمّت بندھائے ہوئے ہے۔اور آپ اتنے بڑے، اتنے مضبوط ہو کر بھی میری ہمّت مسلسل توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

ارشد صاحب نے ایک بے بسی بھرا سانس خارج کیا تھا۔ وہ کیا کرتے؟ کیسے سمجھاتے اسے؟

"آپ کو خدا کا واسطہ ہے، پاپا۔ مجھے بزدل مت بنائیں۔ بہادر بنائیں۔ اللہ حافظ۔"، بول کر اس نے اگلے ہی پل فون رکھا تھا اور اٹھ کر چلتی ہوئی تیزی سے واش روم کی جانب بڑھی تھی۔ پیچھے سے دروازہ بند کر کے وہ سنک کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔۔۔ مگر آج اس کا لہجہ اور اس کی مضبوطی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوئی تھی۔آج وہ کمزور نہیں پڑی تھی۔آج وہ ڈٹی رہی تھی۔

اس نے سنک پر اپنی دونوں ہتھیلیاں جما کر چہرہ اٹھا کر سامنے لگے بڑے سے گول شیشے میں اپنا عکس دیکھا تھا۔ وہ عکس کسی مضبوطی کے مجسمہ کا تھا۔ وہ کمزور مٹی کے ڈھیر جیسا نہ تھا۔ وہ برف جیسا سرد اور سخت تھا۔ وہ آنکھیں کسی اور کی نہیں، رمیص جہانزیب کی بیوی کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں بھی مضبوطی کی ضامن تھیں۔ وہ رونے کے لیے نہیں بنی تھیں۔

اس نے بے ساختہ ہی اپنے ہاتھوں اور پھر ناخنوں کو دیکھا تھا۔ چمکتے ہوئے گلابی ناخنوں پہ نظر پڑی تو اب کی بار تکلیف کے ساتھ ساتھ شدید غصّے نے بھی اس کے اندر سر اٹھایا تھا۔ وہ ٹھانے بیٹھی تھی۔

کہ نہیں چھوڑے گی ان درندوں کو۔ نہیں چھوڑے گی ان بھیڑیوں کو جنہوں نے اس کی کل کائنات اس سے جدا کر دی تھی۔ اس کا عزم پختہ تھا۔ عقد مضبوط۔ وہ اب ایک ایسی چٹان تھی، جس پہ اگر کوئی دراڑ پڑے تو بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ وہ ایسی چٹان تھی جو مضبوطی سے طوفان کے سامنے کھڑی، اپنے پہلو میں اپنی اولاد کو چھپائے ہوئے تھی۔ وہ انہیں کچھ بھی نہیں ہونے دے گی، یہ تو طے تھا۔

آج اس نے طے کر لیا تھا کہ جس جس انسان نے اس کے شوہر کے ساتھ جو جو کیا تھا، اس کے ساتھ بھی وہ وہ ہی ہو گا۔ ناخن کے بدلے ناخن۔ بینائی کے بدلے بینائی۔ طے ہو گیا تھا۔ آگے اللہ حامی و ناصر تھا۔

☆☆☆

باہر رات کا اندھیرا ہنوز ویسے ہی پھیلا ہوا تھا۔ بس تیز رفتاری سے چلتی، آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ بس کے اندر کا ماحول مکمل طور پر خاموش اور سن سا معلوم ہوتا تھا۔ زیادہ تر مسافر سوئے ہوئے تھے۔ اے سی کی تیز ٹھنڈک اسے اپنے جسم میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بس کی کھڑکی سے سر ٹکائے، شیشے سے باہر دیکھتی جا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے نیند بالکل عنقا تھی۔ وہ صرف پیچھے کو جاتی سرمئی دھار کو دیکھ رہی تھی جو بس کے ٹائروں کے نیچے سے ہوتی پیچھے کی اور جاتی جا رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں ویرانی چھائی تھی۔ اس کے ذہن نے بالآخر یہ بات قبول کر لی تھی کہ وہ اب اپنے گھر سے بہت دور جا رہی

تھی۔۔۔وہاں جہاں کوئی اس کی گندمی رنگت کو زیر بحث لا کر اس کی روح کو چھلنی نہیں کرے گا۔وہاں جہاں اسے باقی سب لوگوں سے بلاوجہ حقیر نہیں سمجھا جائے گا۔

البتہ ابھی تک وہ اپنی اور رضیہ بیگم کی ہمّت پر بے یقین تھی۔کیسے ان دونوں نے اتنی ہمّت اور بہادری کا مظاہرہ کر لیا؟آخر کیسے؟

"ٹیک کیئر،مونی۔"،روحان کے الفاظ ذہن میں گونجے تو وہ اداسی سے مسکرادی۔وہ دن واقعی بہت اچھے تھے۔دن کے وہ دو گھنٹے جب وہ صحیح سے اپنی زندگی کو انجوائے کرتی تھی اور سارے غم بھول جایا کرتی تھی۔

ماضی کی یادیں اس کے ذہن کو جکڑنے لگیں تو اس نے بھی سر ہنوز کھڑکی سے ٹکائے آنکھیں موند لیں۔ذہن پیچھے جاتا جا رہا تھا۔یادوں کے دھندلے مناظر ذہن کے اوراق پر نمودار ہونے لگے تھے۔وہ بند آنکھوں سے ہی دھیرے سے مسکرائی تھی۔

دس سال پہلے۔۔۔

منظر شام کا ہے۔ حیدر آباد میں موجود ایک چھوٹے سے دو منزلہ گھر میں اس وقت خوب گہما گہمی اور رش لگا تھا۔ بہت سے چھوٹے بڑے بچے زمین پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ ایک جانب ایک آدمی کے گرد دائرہ بنائے ان سے کام سمجھنے میں مصروف تھے جبکہ کچھ اپنی کاپی پر سر جھکائے پڑھنے اور سبق یاد کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ایک دوسرے کے کان کے پاس جھکے سرگوشیاں کرتے ایک دوسرے کی جانب اشارہ کرتے، پھر زور سے ہنس دیتے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو ایک گروپ سا بنائے پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں بھی مصروف تھے۔

ایسے ہی ایک گروپ میں اس وقت پانچ لوگ سر جوڑے دبی دبی آواز میں ہنس رہے تھے۔ ان کی کاپیاں ان کے سامنے پڑی تھیں اور وہ سب ایک دوسرے سے کچھ نا کچھ کہتے ہنستے جا رہے تھے۔ ان پانچ میں ہی وہ تین بھی شامل تھے۔۔۔ ایمان، ارتضی اور روحان۔

پھولوں والی چھوٹی آستینوں والی فراک پہنے، کاندھے تک آتے بالوں کو دو پونیوں میں مقید کیے، وہ سیاہ چمکتی آنکھوں کو گول کیے، اب کے جھک کر ارتضی کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی۔

اس کی پوری بات سن کر ارتضی ایک دم سے پیچھے ہو کر بہت زور سے ہنس دیا تھا۔وہ تب بھی ویسا ہی تھا جیسا اب تھا۔فرق بس عمر کا تھا۔باقی حلیہ ویسا ہی تھا۔

سادہ سے سرمئی رنگ کے شلوار قمیض پہنے، شہد رنگ بالوں کو سلیقے سے پیچھے کو کنگھی کیے، وہ مسکراتی شہد رنگ آنکھوں کے ساتھ ویسا ہی سوبر اور سلیقے مند لگتا تھا۔اس کے برابر میں ہی روحان بیٹھا تھا۔پینٹ شرٹ پہنے، بھورے بالوں کو ماتھے پر بکھیرے، وہ بھوری چمکدار آنکھوں سے اپنے ساتھ بیٹھے تمام لوگوں کو دیکھتا، اب کچھ کہہ رہا تھا۔اس کی بات سن کر باقی سب ہنسے تھے۔

"روحان، رضا، مونی، کاکا، میرو۔ادھر آؤ۔"، جبھی پیچھے سے ایک سنجیدہ سخت سی مردانہ اواز گونجی تو ان سب کی ہنسی کو بریک لگا اور انہوں نے چہرے موڑ کر انہیں دیکھا۔وہ تقریبا پچاس سال تک کے نفیس سے آدمی تھے۔بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھوں والے۔کریم رنگ کے بے داغ شلوار قمیض پہنے، ہاتھ میں ایک سیاہ قلم تھامے، وہ سختی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"سروہ۔۔۔"، کاکا نے ابھی کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی ہی تھی کہ

"سمجھ نہیں آئی میری بات؟ کم ہیئر۔"، اب کے وہ کچھ بلند آواز میں مزید سخت لہجے میں بولے تھے۔لب بھینچ رکھے تھے۔ایک ہاتھ میں قلم تھام رکھا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں ایک لمبی سی ڈنڈی پکڑلی تھی۔ان سب کی سٹی اس ڈنڈی کو دیکھتے ہی گم ہوئی تھی۔بالکل خاموشی کے ساتھ وہ سب کے سب دھیرے سے کھڑے ہوئے تھے اور بچوں کی بھیڑ میں سے رش بناتے ماسٹر جی کے پاس پہنچے تھے۔باتیں کرتے تمام بچے اب کے چپ چاپ دم سادھے کبھی ماسٹر جی کو تو کبھی ان سب کو دیکھ رہے تھے۔

"ہمم؟ تو؟ یاد ہو گیا؟"،انہوں نے سخت سے لہجے میں ان سب پہ نظریں جما کر کہا تھا۔ان کی بات پر کاکا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"جی سر۔۔۔یاد تو کب سے ہو گیا۔آپ کے فری ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ کب آپ فری ہوں اور کب ہم آپ کو سبق سنائیں۔"،اس نے بہت ہی فرمانبرداری سے انہیں دیکھتے ہوئے جواب دیا تو ماسٹر صاحب نے ایک ابرو اٹھائی اور پھر سمجھنے کے سے انداز میں سر اثبات میں ہلایا۔

پھر ڈنڈی کاکا کی جانب کر کے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

کاکا نے ایک نظر ان سب کو دیکھا جو ہمدردانہ انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔اس کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔اس نے قدم ماسٹر صاحب کی جانب بڑھائے اور کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر مؤدب سا کھڑا ہو کر سر جھکا لیا۔

"ہمم۔۔۔تو کاکا، پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کون تھے، بتانا پسند کریں گے آپ؟"، ماسٹر صاحب بڑے کڑے تیور لیے اسے گھورتے ہوئے سختی سے پوچھ رہے تھے۔کاکا نے لب دانتوں تلے دبا کر چہرہ کچھ اس طرح سے موڑا کہ بظاہر تو وہ ماسٹر صاحب کی جانب متوجہ تھا، مگر دھیان اب کے سارا مونی پر تھا۔وہ ابرو اٹھا کر اس سے گویا جواب بتانے کی التجا کر رہا تھا۔ماسٹر صاحب نے ہلکا سا مسکرا کر اس کی یہ حرکت بڑے مزے سے ملاحظہ فرمائی تھی، اور پھر اسی سرعت سے مسکراہٹ چھپا کر اسے یونہی دیکھے گئے تھے۔

"کاکا۔آئی ایم ویٹنگ۔"، انہوں نے اس کی کچھ پلوں کی خاموشی کے بعد بڑے جتاتے انداز میں ایک بار پھر کہا تھا۔ڈنڈی کا رخ ہنوز اسی کی جانب تھا۔چہرے کی سختی بھی ویسے ہی قائم تھی۔

www.novelsclubb.com

"قائداعظم۔"، بڑی ہی ہلکی سی سرگوشی نما آواز میں اس کے برابر میں کھڑی میرو کی زبان سے پھسلا تو ماسٹر صاحب نے سنجیدگی سے اس کی جانب رخ کیا۔

"تم نے اپنا نام بدل کر کاکا رکھ لیا ہے، میرو؟"، انہوں نے اس انداز میں کہا کہ وہاں موجود سبھی بچوں کی گھٹی گھٹی سی ہنسی کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"ششش۔"، انہوں نے فوراً ہی سختی سے کہا تو اگلے ہی پل ساری ہنسی کی آوازیں دم توڑ گئیں۔

سبھی بچّے لبوں پر انگلی رکھے، ٹکٹکی باندھے کبھی ماسٹر صاحب کو تو کبھی ان پانچوں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ تماشہ ان سب کا ہی فیورٹ تھا جو ہر ایک دو دن میں ہی خوب پبلیسٹی کے ساتھ نشر ہوا کرتا تھا۔

www.novelsclubb.com

میرو اب کے مؤدب سی ہاتھ باندھے، چہرہ جھکائے کھڑی ہو گئی تھی۔ ماسٹر صاحب کی نظریں۔۔۔اف۔۔۔ بڑی خطرناک ہوا کرتی تھیں۔ صحیح سلامت بندے کو کلمہ پڑھوا دینے کی حد تک خطرناک!

"کاکا۔۔آج تمہاری چھٹی بند ہے، سنا تم نے؟"، اب کے ماسٹر صاحب نے کاکا کو سیدھ میں

دیکھتے ہوئے کہا تو کاکا کی گول گول سیاہ آنکھوں میں نمی اُمڈ کر آنے لگی۔ لب خود بخود رونے کے لیے پھر پھرانے لگے۔ بمشکل اس نے گلٹی حلق سے اتار کر باقی سب کو دیکھا جو بڑی ہمدردی اور ترحم سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اور تم سب کی بھی۔"، ماسٹر صاحب کے اگلے جملے پر ان سب کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب نے ہی بے یقینی اور بے بسی سے چہرہ موڑ کر ماسٹر صاحب کو دیکھا تھا جو اب ان سب کو ڈنڈی سے جگہ پر واپس جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ان سب نے نم آنکھیں جھکا کر اپنی جگہ کا رخ کیا تھا۔ تمام طلبات دم سادھے ہوئے تھے۔ اب کے کسی کو بھی اپنی چھٹی بند کروانے کا شوق جو نہ تھا۔

"اب میں کیا کروں گی؟"، وہ سب اپنی جگہ پر آکر پھر سے بیٹھ گئے تو کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میرو کی لرزتی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ان سب نے ہی یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، جس کی سبز آنکھوں کے پپوٹوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔ وہ سب سے زیادہ نرم دل اور حساس طبیعت کی مالک تھی۔ فوراً ہی رونے لگی تھی۔ مونی فوراً سے اس تک گئی تھی اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"ارے میرو۔ کیا ہو گیا ہے؟ سر تو ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔ چھٹی اصل میں تھوڑی بند کریں گے،

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

ہے ناں؟"، اس نے بڑے بڑوں کے سے انداز میں اسے تسلی دے کر سمجھاتے ہوئے کہا تو میرو اسے متورم آنکھوں سے یوں دیکھنے لگی جیسے اسے اس کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"یقین نہیں میری بات کا؟"، اب کے مونی نے کمر پر ہاتھ ٹکا کر لڑاکا عورتوں کے سے انداز میں کہا تو میرو نے جھٹ سے سر نفی میں ہلایا۔ رضا، روحان اور کاکا کی ہنسی بے ساختہ تھی، جنہیں انہوں نے فوراً ہی سرعت سے دبالیا تھا۔ مونی نے لب بھینچے تھے۔ ابرو سکیڑی تھی اور میرو کے کچھ قریب آئی تھی۔

"تمہیں پتا بھی ہے کہ تم کس کی بات ماننے سے انکار کر رہی ہو؟ ایمان زاویار کی بات کا یقین نہیں کر رہی ہو تم۔۔۔"، ابھی وہ اپنے نام اور اپنے انداز کا صحیح سے بھرم مار بھی نہ پائی تھی کہ پیچھے سے ایک ایسی سخت سی آواز گونجی کہ اس کی چلتی زبان کو لاک سا آ لگا۔

"مجھے بتائیے، محترمہ ایمان زاویار صاحبہ۔۔۔ کہ اور کیا کیا خاص خوبیاں جڑی ہوئی ہیں آپ کی ماہان و عالیشان شخصیت میں۔"، نہایت شستہ انداز میں کہہ کر ماسٹر صاحب بڑے کڑے تیور لیے اسے بازو سینے پہ لپیٹے دیکھ رہے تھے۔ ان کی جانب اس کی پشت تھی۔۔۔ مگر ان چاروں نے

بڑے واضح طور پر گلٹی اس کے گلے سے اترتے دیکھی تھی۔ بہت ہی دھیرے سے وہ پیچھے مڑی تھی اور ماسٹر صاحب کو دیکھا تھا۔

"ہم ویٹ کر رہے ہیں۔۔۔ راجکماری مونی زاویار کی ماہان ہستی کی خوبیاں جاننے کا۔"، ایک ابرو اچکا کر ماسٹر صاحب نے خاصے جتاتے انداز میں کہا تھا۔ مونی کی سٹی گم ہوئی تھی۔

"نہیں سر۔۔۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ بیچاری رو رہی ہے نا، جبھی دلاسہ دے رہی ہوں۔ اور کچھ نہیں۔"، اس نے بڑوں کے سے انداز میں ہاتھ ذرا سے جھلا کر جواب دیا تھا۔ ماسٹر صاحب نے آنکھیں سکیڑی تھیں اور اپنی گود میں رکھی پتلی سی ڈنڈی اٹھائی تھی۔ ایمان پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ تو کیا اب اس کی شامت آنے والی تھی؟

رضا، روحان اور کاکا بڑی مشکلوں سے اپنی بے قابو ہوتی ہنسی کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اسی پل حلق پھاڑ پھاڑ کر ہنسی سے دوہرے ہو جاتے۔۔۔ مگر ماسٹر صاحب کی ڈنڈی سبھی کو سیدھا رکھا کرتی تھی۔

"ناؤ۔۔۔ فوکس آن یور اسٹڈیز۔"، اب کے ماسٹر صاحب بڑے ضبط سے دانت پہ دانت جما کر

گرجے تو مونی نے سرعت سے گردن پھیر کر کاپی پہ جھکا دی۔ باقی چاروں بھی چپ چاپ پڑھنے لگے تھے۔ میرو کے بے قابو ہوتے مچلتے آنسو بھی خود بخود ہی گویا واپس آنکھوں میں چلے گئے تھے۔

"تم لوگ کیا سن ہوئے بیٹھے ہو۔ پڑھو۔"، اب کے اس اگلی گرج پر باقی سارے طلباء بھی فوراً سے اپنی اپنی کتابوں پر جھک گئے تھے۔ شو ٹائم ختم ہو گیا تھا۔ پڑھائی کا ٹائم شروع ہو چکا تھا۔

وہ بڑی نم آنکھوں سے حال میں واپس لوٹ آئی تھی۔ اس کے رخسار بھیگے ہوئے تھے۔ شاید وہ ان خوبصورت دنوں کو یاد کر کے روئی بھی تھی۔ بہر حال، اسے علم نہ ہو سکا تھا۔ اس نے ہتھیلی سے دونوں رخسار پونچھ کر بس کی کھڑکی کے بڑے سے شیشے سے باہر دیکھا تھا، جہاں دور افق پر آفتاب اپنی پہلی کرنیں بکھیرتا، طلوع ہوتا نظر آرہا تھا۔ یہ منظر نگاہوں کو خیرہ کر دینے کی حد تک حسین و جمیل تھا۔ وہ بھی کھوئی کھوئی سی طلوع آفتاب کو دیکھے گئی تھی۔ آنکھیں اب بھی نم دکھتی تھیں۔

☆☆☆

فجر حیدر آباد پر اتری تو صحن میں چارپائی ڈال کر لیٹے افراد میں سے ایک نے کروٹ بدلی۔۔۔اور پھر دھیرے سے آنکھیں ملتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھے اور گہرے نیلے جامنی سے آسمان کو دیکھا۔ سماعتوں میں پرندوں کے مدھر نغمے رس گھولنے لگے تھے۔ہوا خاصی ٹھنڈی اور تازہ سی چل رہی تھی۔

ایسے میں انہوں نے پیر چارپائی سے نیچے اتار کر پیروں میں چپلیں اڑسیں اور مندی مندی آنکھوں سے آسمان کو تکتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔بے ساختہ ہی ان کا سر چکرایا تو وہ فوراً سے سر تھامے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ان کا سر نیند کی زیادتی کے باعث چکرایا تھا۔آنکھیں مسل کر انہوں نے پھر آسمان کو دیکھا تھا۔۔۔بصارت اب کے پہلے سے بہتر ہونے لگی تھی۔دھندلاہٹ کم ہوئی تو وہ اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئے۔

وضو وغیرہ کر کے انہوں نے مسجد کا رخ کیا۔البتہ جانے سے پہلے بے ہوشی کی نیند سوئے زرار کو زوروں سے ہلانا نہیں بھولے تھے۔زرار بوکھلا کر نیند سے جاگا تھا اور مندی مندی آنکھیں لیے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"کیا ہوا، ابّا؟"

"اٹھ جا، نالائق۔ نماز پڑھ لے۔ وقت نکل رہا ہے۔"، وہ برہمی سے کہتے ہوئے سر پر جالی دار ٹوپی پہنتے، باہر کی جانب بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

کراچی کے وسط میں قائم بس اڈّے پر اس وقت حیدر آباد سے آئی بس رکی تھی۔ بس کے شیشے کے دروازے ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو مسافرین اپنا اپنا ساز وسامان اٹھائے، ایک کے بعد ایک باہر نکل کر آنے لگے۔ انہی میں سے ایک وہ بھی تھی۔۔۔ وہی، سیاہ آنکھوں، سیاہ عبائے اور نقاب والی۔۔۔ درمیانے قد کی لڑکی۔ کاندھوں سے ایک سیاہ چمڑے کا بستہ لٹکا رکھا تھا۔ سیاہ عبائے کے اوپر ہی اس نے حسنہ کی دی ہوئی بڑی سی سنہری رنگ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔

وہ بڑے محتاط سے انداز میں وہاں سے نکلتی، بستے کی اسٹریپس پر اپنی گرفت مضبوط کیے، نگاہیں ادھر ادھر گھماتی آگے بڑھی تھی۔ سامنے ہی اڈّے سے کچھ ہی فاصلے پر رکشوں اور کالی پیلی

ٹیکسیوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ان کے اگلے جانب ویگنیں بھی ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ ایمان نے ایک نظر ان تمام رکشوں، ٹیکسیوں اور ویگنوں کو دیکھا تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس میں جائے۔

ویگن میں مزید لوگوں کے ہونے کے باعث ایک خطرہ سا تھا کیونکہ اس کے بستے میں اچھا خاصا قیمتی زیور تھا۔ پھر ٹیکسی کو دیکھا اور ایک نظر سر اٹھا کر اوپر آسمان کو دیکھا جس پر گہرے سرمئی و سیاہ سے بادل آکر جمع ہونے لگے تھے۔اسی وجہ سے حبث بھی اچھا خاصا بڑھ گیا تھا۔ بالآخر اس نے رکشے کو دیکھتے ہوئے قدم رکشوں کی قطار کی جانب بڑھائے تھے۔ابھی وہ چند ہی قدموں کے فاصلے پر تھی کہ تین چار رکشے والے اس کی جانب چلے آئے۔

"باجی۔۔۔ کہاں جانا ہے؟"

"آجاؤ باجی۔ادھر آجاؤ۔"

"کدھر جائے گا تم؟"

"آیئے باجی۔۔۔ مناسب کرایہ لوں گا میں۔"

وہ تمام ہی مسلسل ایک ہی طرح کی رٹ لگائے اس کے گرد گھومنے لگے تھے۔ایمان نے اکتاہٹ سے ان سب کو دیکھ کر قدم آگے بڑھائے تھے۔ایک تو نیا انجان سا شہر، دوسرا کوئی جاننے والا بھی نہیں۔اور تیسری یہ رٹ جوان رکشے والوں نے لگا رکھی تھی۔رکشوں کی قطار کے بالکل بیچ میں ہی ایک رکشہ کھڑا تھا جس کے اندر پچھلی سیٹ پر ایک آدمی جو کہ غالباً اس رکشے کا مالک تھا، بڑے شاہانہ انداز میں ٹانگیں پھیلائے نیم دراز تھا۔ایمان سیدھی اس تک گئی تھی۔ایمان کو آتا دیکھ کر وہ یکدم ہی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"جی باجی؟"

"ناظم آباد جانا ہے۔کتنا کرایہ لیں گے؟"،اس کے پوچھنے کی ہی دیر تھی کہ باقی تمام رکشے والے منہ بناتے، بڑبڑاتے ہوئے اپنے اپنے رکشوں کی جانب بڑھ گئے۔

"باجی۔۔۔آپ کتنا دو گی؟"

"آپ بتائیں کہ کتنا لیں گے۔وہاں جا کر کوئی چالاکی نہیں ہو گی کہ باجی، راستہ لمبا تھا۔یہ، وہ۔جو کہیں گے، وہاں پہنچ کر بھی وہی دوں گی۔نہ ایک آنہ زیادہ، نہ ایک آنہ کم۔"، وہ اپنے سخت سے

لہجے میں بولی تو رکشے والا سر جھٹک کر ہنس دیا۔

"آنوں کا زمانہ ہی کہاں رہا ہے، باجی۔ سات سو روپے دے دینا۔"، وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اگلی سیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا تو ایمان سر ہلا کر پیچھے بیٹھ گئی۔

اگلے ہی پل رکشہ قطار سے نکلتا، مین روڈ پر گامزن ہو گیا تھا۔ وہ ایک جانب کو ہو کر بیٹھی ہوئی تھی اور بستہ اب بھی اپنی پشت پر ہی رکھا ہوا تھا۔ چہرہ موڑ کر باہر کے مناظر کو دیکھا تو اپنا شوق یاد آیا جو اسے کراچی جانے کا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی کراچی جانے کا بہت شوق رکھتی تھی۔ کراچی کے بارے میں بہت سنا تھا۔

یہاں کے کھانے، یہاں کی رونقیں، یہاں کی جگہیں، یہاں کا سمندر۔۔۔ سب دیکھنے کا بہت شوق تھا۔۔۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ جب وہ کراچی پہنچے گی، تو حالات یہ ہوں گے۔ وہ کراچی یوں پہنچے گی جیسے کوئی چور چوری کر کے کسی غار میں جا چھپے۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی اور رخ موڑ لیا تھا۔ اب کے وہ اپنی گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے آج کراچی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ دل کچھ بھی دیکھنے کا نہیں چاہ رہا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

☆☆☆

"امّاں۔۔۔امّاں۔"، فاطمہ حواس باختہ سی لاؤنج میں آئی تھی۔ سامنے ہی رضیہ بیگم بڑے ہی آرام دہ انداز میں صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھیں۔ چہرہ بالکل سپاٹ و بے تاثر دکھتا تھا۔ نگاہیں سرد سے انداز میں انہوں فاطمہ کی جانب پھیری تھیں۔

"ہوں؟"

لہجہ اور انداز بھی اتنا ہی بے تاثر محسوس ہوتا تھا۔ لاؤنج میں بہت سی کزنز بھی ادھر ادھر گھومتیں، کام نمٹا رہی تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کا لحاظ کرتے ہوئے فاطمہ حواس باختگی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آکر صوفے پہ بیٹھی تھی اور ان کے کان کے پاس جھک کر دھیرے سے لڑکھڑاتی آواز میں بولی تھی۔

"آپی کمرے میں موجود نہیں ہیں، امّاں۔۔۔ واش روم میں بھی نہیں ہیں۔ میں نے ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔ کہیں بھی نہیں ہیں۔"، وہ نم آنکھوں اور پھولے سانسوں کے درمیان عجیب سی کیفیت کے زیر اثر بولتی جا رہی تھی اور رضیہ بیگم بڑے سکون سے سب سن رہی تھیں۔ اس کی

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

پوری بات سن کر بھی انہوں نے کوئی ری ایکشن نہ دیا تھا۔فاطمہ نے ان کو شانے سے ہلایا تھا۔

"امّاں۔۔۔میں کچھ کہہ رہی ہوں۔"،وہ ان کی لاپرواہی اور بے نیازی پر بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔کیا ہو گیا تھا انہیں؟

"جا کر اپنے ابّا کو بتاؤ تم یہ بات۔"،انہوں نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا تو فاطمہ کو ان کی دماغی حالت پر شبہ سا ہوا۔اس نے ایک بار پھر ان کا شانہ ہلایا تھا۔

"ابّا پاگل ہو جائیں گے،امّاں۔"،وہ عجیب سے خوف سے بولی تھی۔

"اتنی جلدی نہیں ہوں گے۔"،انہوں نے یونہی پچھلے انداز میں جواب دیا تو فاطمہ کو اب کے یقین سا ہو گیا کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔وہ فکرمندی سے اٹھ کر ابھی آگے بڑھنے ہی والی تھی کہ صوفے کے پیچھے اسے کسی کے ہونے کا گمان ہوا۔اور جونہی اس نے گردن موڑی،اس کا سانس تک سوکھ گیا۔

صوفے کے پیچھے زاویار صاحب بڑی خاموشی سے سرخ انگارہ آنکھیں لیے،لب بھینچے،ہاتھ پشت پہ باندھے کھڑے تھے۔ان کا چہرہ صاف بتلاتا تھا کہ وہ پوری گفتگو سن چکے ہیں۔

www.novelsclubb.com

"ا۔۔۔ابّا۔"، ہکلاہٹ سے اس نے بمشکل یہ الفاظ ادا کیے تو رضیہ نے بھی اس کی جانب ایک نظر ڈال کر چہرہ پوری طرح موڑ کر زاویار صاحب کو دیکھا تھا، جو ضبط اور غصّے سے سرخ پڑ رہے تھے۔ رضیہ بیگم انہیں دیکھتے ہی فوراً سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور ان کے بالکل مقابل آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

نجانے کیوں، مگر آج زاویار صاحب کو ان کی آنکھوں میں ایک بغاوت، ایک غدّاری سی نظر آئی تھی۔۔۔جو آج سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

"ایمان کہاں گئی ہے، رضیہ؟"، بمشکل اپنے اشتعال پہ ضبط کرتے ہوئے انہوں نے دہکتے انگاروں والے لہجے میں پوچھا تھا۔ان کی آواز دھیمی تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ رضیہ بیگم اور فاطمہ تک بخوبی پہنچ چکی تھی۔

"بھیج دیا ہے میں نے اسے۔"، اور ان کی حیرت کی انتہا تب نہ رہی جب رضیہ نے کافی بلند اور واضح آواز میں خاصا جتا کر جواب دیا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ ٹھہر کر ساکت اور حیران نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تھے، جن کی آنکھوں میں اس وقت محض سختی تھی۔ زاویار

www.novelsclubb.com

صاحب نے ایک گہرا سانس لے کر خود کو قابو کرنا چاہا تھا۔سب کچھ ان کی سمجھ سے باہر ہو رہا تھا۔ان کی مٹھی خود بخود ہی بھینچتی چلی گئی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"،انہوں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی تھی، مگر پھر بھی جب بولے تو الفاظ اور آواز میں ایک غرّاہٹ سی تھی۔یوں جیسے کوئی شیر بپھر کر دھاڑ رہا ہو۔یوں جیسے بجلی کڑک رہی ہو۔یوں جیسے یہ ان کے صبر اور برداشت کی آخری حد تھی جو کہ پار کر لی گئی ہو۔

"جو آپ سن رہے ہیں۔"، مگر وہاں بھی بے خوفی اور پر اعتمادی اپنے عروج پر تھی۔آواز میں ان کے غرّاہٹ تو نہیں،البتہ اشتعال ضرور تھا۔یوں جیسے صبر کے سارے بند ٹوٹ گئے ہوں۔ یوں جیسے اب چیزیں برداشت سے باہر ہو رہی ہوں۔یوں جیسے بس،اب بہت ہو گیا ہو!

زاویار صاحب کی بھینچی مٹھی بے ساختہ ہی ڈھیلی پڑی تھی۔آنکھوں میں بے یقینی در آئی تھی۔۔۔وہاں شاید شکست پر تلملاہٹ بھی واضح نظر آ رہی تھی۔یوں جیسے وہ زندگی کے بڑے اہم و بڑے میدان میں شکست کھا گئے ہوں۔

یوں جیسے انہیں منہ کی کھانی پڑی ہو۔۔۔

وہ ساکت تھے۔۔۔ بالکل پتھر کی طرح۔ رضیہ بیگم نے ایک قدم ان کی جانب بڑھایا تھا اور ان کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑھ کر بے خوفی سے گویا ہوئی تھیں۔

"جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو سمجھ لو کہ اس کا اختتام قریب ہے۔۔۔ آپ نے ظلم کی ہر حد پار کر لی تھی، زاویار صاحب۔ اور اب میں نے اس ظلم کا اختتام کر دیا ہے۔"، زاویار صاحب ساکت و جامد، پتھر کا مجسمہ بنے انہیں دیکھے گئے تھے۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ چہرے پر اب کے کوئی غصّہ نہیں تھا۔۔۔ وہاں اب صرف ایک بے یقینی تھی۔ یوں جیسے وہ یقین نہ کر پا رہے ہوں کہ وہ اب کی بار ہار چکے ہیں۔ ہمیشہ سر اٹھا کر فتح یاب ہونے والے زاویار احمد صاحب اپنی بیٹی سے ہار چکے تھے۔

اور انہیں یہ ہار ہرگز قبول نہیں تھی۔ وہ اگلی ہی پل بری طرح بپھر کر صوفے سے گزر کر رضیہ بیگم کے سامنے آئے تھے۔ ان کا ضبط، ان کا صبر، ان کی برداشت۔۔۔ سب جواب دے گئی تھی۔ اگلے ہی پل ان کا بھاری بھر کم سا ہاتھ اٹھا تھا اور رضیہ بیگم کے رخسار پر ایک گہری چھاپ

چھوڑ گیا تھا۔

سب نے بے ساختہ شاک سے اپنے منہوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"ماموں جان۔۔۔ یہ آپ۔۔۔"، ابھی گلناز نے آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی ہی تھی کہ فاطمہ نے اگلے ہی پل سرخ پڑتے چہرے اور دھواں ہوتے کانوں کے ساتھ آگے بڑھ کر فورا سے پہلے ماں کو اپنے پیچھے کیا تھا اور اگلے ہی پل اس نے بہت ہی زور سے زاویار صاحب کو پیچھے کی جانب دھکا دیا تھا۔ گلناز سمیت باقی سب شاکڈ سے کھڑے رہ گئے تھے۔

"ہمّت کیسے ہوئی آپ کی میری ماں پر ہاتھ اٹھانے کی؟"، وہ حلق کے بل دھاڑی تھی۔ سب کچھ اپنی جگہ، باپ کی محبت اور عزّت بھی اپنی جگہ، مگر یہ اس کے لیے بالکل نا قابل قبول تھا۔ اس موقع پر پورا خاندان ان کے گھر میں موجود تھا، اور ان سب کے درمیان کھڑے ہو کر انہوں نے آج جو کیا تھا، اس سے انہوں نے اپنی پسندیدہ اولاد کو بھی کھو دیا تھا۔

وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوئے تھے۔ اور شدید بے یقینی کے عالم میں انہوں نے بیٹی کو دیکھا تھا۔

یہ وہی بیٹی تھی جسے انہوں نے ہمیشہ دوسروں پر فوقیت دی تھی۔ یہ وہی بیٹی تھی جس پر ان کو بڑا ناز تھا۔ یہ وہی تھی جس سے ان کو بے پناہ محبت اور انسیت تھی۔ وہ ساکت نظروں سے ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے جس پر بیک وقت دکھ اور غصّہ واضح نظر آ رہا تھا۔

"ہمیشہ آپی کے ساتھ آپ کی ہر زیادتی دیکھی، برا لگا کرتا تھا۔۔۔ مگر پھر بھی چپ رہی۔ کہ آپ میرے ساتھ تو صحیح سے پیش آتے تھے نا۔ یہاں تک کہ آپ اس سے دشمنی اور کینے میں اس حد تک بڑھ گئے کہ اس کی شادی اس سے دگنی عمر کے آدمی سے کرنے لگے۔۔۔ تب بھی میں چپ رہی۔۔۔ جانتے ہیں کیوں؟"، نجانے کیسے تین چار آنسو لڑیوں کی سی صورت اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہتے چلے گئے تھے۔ وہ ساکت سے اسے دیکھتے جا رہے تھے جو دہکتے لہجے میں اب بھی کہہ رہی تھی۔

"کیونکہ میں ایک اچھی بہن نہیں تھی۔ میں ایمان سے بہت محبت کرتی تھی، مگر میری محبت میں خود پرستی اور خود غرضی بھی شامل تھی۔۔۔ میں نے اس کے لیے آج تک ایک لفظ بھی نہیں بولا۔۔۔ سوچتی تھی کہ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ مگر آج۔۔۔(آنسو ابل ابل کر اس کے

رخساروں کو بھگو رہے تھے) آج جو آپ نے کیا ہے نا، ابّا۔۔۔ وہ نا قابل برداشت، نا قابل مذمت ہے۔۔۔ آپ نے خود کو میری نظروں سے گرا دیا ہے۔"، بولتے بولتے اس کا تنفس پھولنے لگا تھا۔ حلق بری طرح درد کر رہا تھا۔ اچانک ہی وہ صحن کے داخلی دروازے کی جانب مڑی تھی جہاں ساکت سا زرار کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ ان کی سب سے چھوٹی بہن ہی ہے جو اس قدر بپھری ہوئی ہے۔

"آپ کو شرم تو نہیں آئی ہو گی، ہے نا بھائی؟ بالکل بھی غصّہ نہیں آیا ہو گا۔ بالکل بھی اشتعال نہیں اٹھا ہو گا آپ کے اندر۔۔۔ آپ جایئے۔ اپنی بیوی اور بیٹی کو سنبھالیے۔ اپنی ماں اور بہن کے لیے میں ہی کافی ہوں۔"، وہ غصّے سے ہانپتی ہوئی بولتی جا رہی تھی۔ اس کی آواز بلند سے بلند تر ہو رہی تھی۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہاں کھڑے سب لوگ ساکت کھڑے تھے۔۔۔ بالکل ساکت!

رضیہ بیگم نے اسی دم شانے سے فاطمہ کو اپنی جانب موڑا تھا اور اگلے ہی پل دھپ سے اس کے گلے سے آ لگی تھیں۔ فاطمہ نے بے ساختہ ہی ان کی پشت تھپتھپاتے ہوئے ایک خونخوار نظر سے

www.novelsclubb.com

زاویار صاحب کو دیکھا تھا۔ان کے چہرے پر ندامت اب بھی نہیں تھی۔ہاں مگر وہاں اب تک ویسی ہی بے یقینی چھائی تھی۔

یوں جیسے یقین نہ آرہا ہو کہ گھر کے قیدی اب بولنے لگے ہیں۔قید میں پر پھڑپھڑانے لگے ہیں۔ وہ شاکڈ تھے۔۔۔بے انتہا شاکڈ۔

"شکریہ فاطمہ۔۔۔شکریہ۔"،رضیہ سرگوشی کی سی صورت فاطمہ کے کان میں بولتی جارہی تھیں۔ان کے دل کی دھڑکنیں غیر معمولی طور پر تیز ہورہی تھیں۔فاطمہ ایک نظر زاویار صاحب کو افسوس سے دیکھتی،رضیہ کو تھامے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔سب تو ساکت تھے ہی، مگر زرار زاویار احمد کی آنکھ سے ایک بے مول سا آنسو ٹپک پڑا تھا۔ہاں وہ صحیح کہہ رہی تھی۔۔۔شاید وہ صحیح ہی تھی!

☆☆☆

رکشے والے نے اسے مطلوبہ جگہ پر پہنچایا اور کرایہ لے کر شرافت سے چلتا بنا۔وہ اپنا بستہ

مضبوطی سے تھامے آگے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ بادلوں نے آسمان کو اچھا خاصا گھیر لیا تھا۔ گویا ابھی ٹکرانے کے ہی منتظر لگتے تھے۔ کچھ آگے پہنچ کر اس نے اپنے بستے میں سے رضیہ بیگم کا دیا ہوا موبائل نکالا تھا اور پتہ صحیح سے دیکھا تھا۔ پھر ایک تصویر کھولی تو اس میں ایک گھر موجود تھا۔ سرخ رنگ کا دو منزلہ، صاف ستھرا سا گھر۔ یونہی موبائل ہٹا کر اس نے نظریں سامنے کی جانب کیں تو سامنے ہی اسے گھر نظر آ گیا۔

وہی بڑا اونچا سا سرخ رنگ کا گھر۔۔۔ جس کا اونچا سا داخلی دروازہ بھورے رنگ کا تھا۔ دور سے دیکھنے پر ہی پتا چلتا تھا کہ وہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ اتنی دیر میں پہلی بار ایمان کھل کر مسکرائی تھی۔ دل میں ایک اطمینان، ایک سکون اور ایک خوشی سی محسوس ہوئی تھی۔ بالآخر وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے قدم گھر کی جانب بڑھائے تھے اور موبائل بستے میں اندر کر کے رکھ کر بستے کی زپ بند کی تھی۔

وہ گھر کے قریب پہنچی تو اسے دور سے ہی دروازے کو دیکھ کر ایک گمان سا گزرا کہ وہاں دروازے پر تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ کچھ اچھنبے اور بے یقینی سے وہ آگے بڑھی تو واقعی گھر کو ان لاکڈ

پایا۔ وہ حیران و پریشان سی ابھی وہیں کھڑی تھی کہ گھر کا بڑا سا لوہے کا دروازہ اندر کی جانب کھولا گیا تھا۔ اندر سے ایک تقریباً اس ہی کی عمر کا ایک لڑکا باہر نکل کر آیا تھا اور اب وہ چل کر گھر کے پاس کھڑی بائیک کی جانب گیا تھا۔

ایمان فوراً ہی تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس تک گئی تھی۔ اس کو اپنی حالت غیر ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"ک۔۔۔کون ہو تم؟" بمشکل پھنسے پھنسے سے الفاظ اس کی زبان سے آزاد ہوئے تو بائیک کی کک مارتا لڑکا یکدم ہی اس کی جانب مڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر شناسائی اور سوال سا تھا۔

"جی؟ مجھ سے بات کر رہی ہیں؟"، وہ کچھ نا سمجھی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں۔ کون ہو تم؟"

ایمان کو اپنے پیروں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ حلق سوکھ گیا تھا۔ ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔ گویا کچھ غلط ہونے کا عندیہ دے رہا ہو۔

www.novelsclubb.com

"میں رومان ہوں۔ کیوں؟ آپ کون ہیں؟"، وہ اب بھی اسی غیر شناسائی اور ناسمجھی سے بول رہا تھا۔ آنکھوں میں الجھن نظر آ رہی تھی۔

"تم یہ۔۔۔ یہاں رہتے ہو؟"، کس مشکل سے اس نے یہ الفاظ ادا کیے تھے، یہ اس کے علاوہ صرف خدا ہی جانتا تھا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

"جب میں اس گھر سے نکلا ہوں تو یعنی میں ہی رہتا ہوں گا نا ادھر؟"، وہ جیسے اس کی عقل پر ماتم کر رہا تھا اور بہت ہی اکتاہٹ لہجے میں سموئے اس سے کہہ رہا تھا۔ ایمان کو سانس لینے میں دشواری ہونے لگی تھی۔ آنکھیں اچھی خاصی نم ہو گئی تھیں۔ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔

"کس۔۔۔ کس نے بیچا ہے تمہیں یہ گھر؟"، اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔ آس پاس جیسے دھماکے ہونے لگے تھے۔ وہ وہ نہیں سننا چاہتی تھی جو اس کا دماغ اسے کہہ رہا تھا۔ اس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

"زرار زاویار صاحب نے۔"، اس لڑکے نے نہایت سادگی سے کہتے ہوئے بائیک اسٹارٹ کی

www.novelsclubb.com

تھی اور اگلے ہی پل اس کے برابر میں سے گزارتا ہوا آگے بڑھا لے گیا تھا۔ پیچھے ایمان زاویار کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ کانوں سا گویا دھواں سا نکل رہا تھا۔ ایک تواتر کے ساتھ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہنے لگے تھے۔

تو کیا اسے کہتے ہیں رسوائی؟ اسے کہتے ہیں بے گھری؟ اسے کہتے ہیں خوار ہونا؟ تو کیا اس کی قسمت میں بھی خواری، بے گھری اور رسوائی ہی لکھی گئی تھی؟ اس وقت اسے زرا رپہ نہ تو غصّہ آ رہا تھا، اور نہ ہی افسوس ہو رہا تھا۔۔۔ اسے بس رہ رہ کر اپنی قسمت پہ حیرانی ہو رہی تھی۔

کیا اتنی تکلیفیں تھیں اس کی قسمت میں؟ کیا اس کی زندگی میں سکون کے پل اتنے کم تھے؟ بس؟ وہ الٹے قدموں مڑی تھی۔۔۔ اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ آنسو اب بھی متواتر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ آج آنسوؤں کو بہہ جانے دے رہی تھی۔ اور کوئی چارہ جو نہ تھا!

www.novelsclubb.com

اسی پل ایک موٹی سی بوند آسمان سے گرتی، اس کے چپلوں میں مقید پاؤں پر گری تھی۔اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ٹھہر کر اپنے پیر کو دیکھا تھا جس پر پانی کے چھوٹے چھوٹے سے ذرّات چمکتے نظر آرہے تھے۔اگلے ہی پل تیزی سے بارش برسنے لگی تھی۔

آج اسے بارش کو دیکھ کر کوئی جوش، کوئی ایکسائٹمنٹ نہیں محسوس ہو رہی تھی۔سارے لطیف احساسات گویا کان لپیٹے، کسی کھائی میں جا گرے تھے۔وہ نجانے کیسے خود کو گھسیٹتی آگے بڑھا لے جا رہی تھی۔آنکھوں سے گرتے آنسو کہاں تھے اور بارش کا پانی کہاں، کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔اس کا دل ہمیشہ بارش کے موسم میں ہی ٹوٹا کرتا تھا۔

جیسے ایک بار اس کا کوئی بہت اپنا جس دن اس سے دور گیا تھا، اس دن بھی تو بارش ہی ہو رہی تھی۔

جس دن آدم کی خبر اس تک پہنچی تھی، اس دن بھی تو بارش ہی ہو رہی تھی۔

جس دن اس کے کسی قریبی نے اسے بتایا تھا کہ وہ جا رہا ہے، اس دن بھی تو بارش ہی ہو رہی

تھی۔

سارے دکھ، سارے جذبات آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وہ متورم سرخ آنکھیں لیے، آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ سانس رکتا محسوس ہونے لگا تھا۔ بصارت دھندلا گئی تھی۔ چہرہ دہک رہا تھا۔۔۔اور وہ۔۔۔وہ بے چھت و بے آسرا انجانے کہاں جاتی جارہی تھی۔ کسی شے کا کچھ ہوش نہ تھا۔

☆☆☆

"جلدی کرو، ثمرین۔ ٹائم نکل جائے گا۔"، گاڑی کی بیک سیٹ پر بیٹھتی ہوئی وہ بڑے مصروف اور جلد بازی کے سے انداز میں کچھ بلند آواز میں بول رہی تھی۔ ثمرین اگلے ہی پل گھر کے داخلے دروازے کو پار کرتی ہوئی اس تک چلی آئی تھی۔

"آگئی باجی۔"، وہ جلدی سے دوڑتی ہوئی دوسری طرف سے آکر گاڑی کا بیک ڈور کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی۔ اندر ارحم پہلے سے بیٹھا ہوا ہی تھا۔ اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔

"کیسا ہے ارحم بابا؟"، وہ مزے سے آنکھیں مٹکا کر پوچھ رہی تھی۔ غزل نے ایک آخری بار گھر پر نظر ڈال کر سارے لاک دیکھ کر سیف ہونے کی یقین دہانی کی تھی اور پھر گاڑی میں ہی چلی آئی تھی۔ سیاہ عبائے اور نقاب میں ملبوس وہ ہمیشہ کی ہی طرح ڈیسنٹ اور اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور اگلے ہی لمحہ زن سے گاڑی پورچ سے نکال کر آگے بڑھالے گیا تھا۔ پیچھے سے چوکیدار نے دروازہ بند کیا تھا۔

☆☆☆

حیدر آباد کے آسمان پر بھی خاصے بادل چھا گئے تھے۔ زاویار احمد صاحب کے گھر میں اس وقت باکل سناٹا تھا۔ گہری خاموشی اور عجیب دل دہلا دینے والا سکوت تھا۔ جس گھر میں کل تک نکاح کے انتظامات پورے زور و شور سے چل رہے تھے، اس وقت وہاں صرف ایک ویرانی اور بے رونقی تھی۔

کھلے سے وسیع صحن کے وسط میں رکھی چارپائی پر اس وقت زاویار صاحب سر جھکائے بیٹھے تھے۔

ان کے سامنے ہی زبیر صاحب اور جلال صاحب بیٹھے انہیں خاموش نظروں سے تک رہے تھے۔

"میں شرمندہ ہوں، زبیر۔"، زاویار صاحب کی شرمندہ سی آواز ان دونوں کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ جلال صاحب خاموش رہے تھے البتہ زبیر نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کیا تھا۔

"آپ مسلمان ہیں ناں، زاویار بھائی؟"، نجانے کیوں انہوں نے یہ سوال کیا تھا۔ زاویار صاحب نے فوراً ہی گردن اٹھا کر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"سب چھوڑیں۔ مجھے بھی ایک جانب کر دیں اور میرے بیٹے کو بھی۔ اپنی بیوی اور بھائی کو بھی ایک جانب کر دیں۔ سامنے صرف اس ایک لڑکی کو رکھیں اور بتائیں۔۔۔ کون تھی وہ آپ کی؟"

"وہ میری جو بھی تھی، اب وہ میری کچھ بھی نہیں رہی۔"، ان کے لہجے میں آج اپنی اس ایک اولاد کے لیے سخت تنفر اور کڑواہٹ تھی۔ شرمندگی صرف سب کے سامنے ہوئی سبکی پر تھی۔ بیٹی کے سامنے اب بھی کوئی احساس، کوئی ندامت نہیں تھی۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"خون کے رشتے ایسے نہیں ٹوٹا کرتے۔"، زبیر نے افسوس سے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"کاش میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی رگوں میں دوڑتا خون بھی نکال باہر کرتا۔"، کڑواہٹ اب بھی ویسی ہی تھی۔ زبیر صاحب نے افسوس سے انہیں دیکھا تھا۔

"ایسے نہیں گزرتی زندگی۔ ایسے نہیں چلتے رشتے۔ آپ کو کم از کم ہماری عزّت کا خیال ہی کر لینا چاہئے تھا، بھائی۔ آپ کو اپنی بیٹی سے کنفرم کرنا چاہئے تھا کہ وہ اس رشتے پر راضی ہے بھی یا نہیں۔"، زاویار صاحب نے شرمندگی سے لب کاٹے تھے۔

"میں نے اس کی بہتری کا فیصلہ کیا تھا۔"، ایک کمزور دلیل، ایک کمزور عذر پیش کیا گیا تھا جس پر زبیر صاحب نے سرعت سے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"نہیں۔ آپ نے اپنی بہتری کا فیصلہ کیا تھا۔"، جس حقیقت سے وہ نظریں چرا رہے تھے، وہی حقیقت زبیر صاحب نے بڑے قطعی انداز میں ان کے سامنے لا کھڑی کی تھی۔ وہ نگاہیں نہیں اٹھا پائے تھے۔

"دیکھیں زبیر صاحب۔ آپ کی عزّت پہ کوئی حرف نہیں آئے گا۔ اگر ایمان نہیں تو فاطمہ ہی

سہی۔آپ عامر کا نکاح فاطمہ سے ہی۔۔۔"،ابھی جلال صاحب نے بات ختم بھی نہ کی تھی کہ ایک دم سے بپھر کر زاویار صاحب نے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"نہیں۔فاطمہ بہت چھوٹی ہے۔"

ان کی بات پر جلال صاحب نے تلخی سے انہیں دیکھا تھا۔وہ جیسے ان کے دوغلے پنے پر ہنس دیئے تھے۔

"بڑی تو ایمان بھی نہیں تھی۔"،زاویار صاحب ایک بار پھر چپ کر گئے تھے۔زبیر صاحب نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کیا تھا اور اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔جلال اور زاویار بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں چلتا ہوں،زاویار بھائی۔امید ہے کہ اب ہم کبھی نہ ملیں۔خدا حافظ۔"،وہ کہہ کر رکے نہیں تھے،لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ان کے جاتے ہی جلال ایک دم سے زاویار کے قریب آئے تھے اور ان کا بازو تھاما تھا۔ان کے بوڑھے چہرے پر ایک کڑک پن، ایک غصّہ سا تھا۔زاویار صاحب نے انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"تم نے رضیہ پر ہاتھ اٹھایا، زاویار؟ وہ بھی سب کے سامنے؟"، وہ عجیب بے یقینی اور اشتعال کے ملے جلے جذبات سے بول پڑے تھے۔ زاویار صاحب کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔ انہوں نے بے ساختہ ہی نگاہیں چرائی تھیں۔ کتنی غلطیاں تھیں ناں ان کی۔ کون کون سی غلطی سدھارتے؟ کون کون سی غلطی مانتے؟

"تمہیں ذرا بھی شرم نہ آئی اس عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے جس نے ہمیشہ ہر کسی کو، حتیٰ کہ اپنی اولاد اور اپنی خود کی ذات کو پس پشت ڈال کر تمہارا ساتھ دیا؟ تم سے سچی رہی؟ تم سے وفادار رہی؟"، جلال صاحب کے لہجہ میں غصّے اور افسوس کی رمق تھی۔ ان کا سپید چہرہ اس وقت دبے دبے غصّے سے سرخ پڑ رہا تھا۔ زاویار صاحب ان کی سمت نگاہیں نہیں اٹھا پائے تھے۔ بڑے بھائی سے چاہے لاکھ اختلافات ہی سہی، لاکھ شکوے، لاکھ شکایات ہی سہی۔۔۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ ان کے سامنے بولنے کی ہمّت آج بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"اور تم نے فاطمہ کا نکاح کرنے سے منع کیوں کیا؟"

"وہ چھوٹی ہے ابھی۔"، ایک کمزور سی دلیل پیش کی گئی تھی۔

"بات دراصل یہ نہیں ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تم فاطمہ سے اتنی محبت کرتے ہو کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی نہیں دیکھ سکتے۔ اور نہ کسی کو اس کے ساتھ زیادتی کرنے دے سکتے ہو۔ باوجود فاطمہ کے آج کے رویے کے، تم اس حقیقت کے آگے بے بس ہو کہ وہ تمہیں بہت عزیز ہے۔ اس کی کوئی بدتمیزی تمہارے لیے بدتمیزی نہیں ہے۔ اس کی کوئی تلخ کلامی تمہارے لیے تلخ کلامی نہیں ہے۔"، جلال صاحب نجانے اور بھی کیا کیا بول رہے تھے مگر زاویار صاحب نے جلتی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ کیسے تاب لاتے اتنا زیادہ سچ سننے کی؟

اور یہ تو ویسے ہی ایک ظالم حقیقت ہے کہ انسان سچ تب تو بالکل نہیں سن سکتا جب اس سچ سے اس کی کوتاہیاں عیاں ہو رہی ہوں۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

"تم جانتے ہو، زاویار؟"، اچانک ہی انہوں نے زاویار صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر افسوس سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ انہیں بے چین اور مضطرب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"اگر تم نے محبت فاطمہ سے کی تھی تو نفرت ایمان سے بھی نہیں کی تھی۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ تم اس سے سخت بیزار تھے۔ خوش ہو جاؤ اب، زاویار احمد خان۔ تمہاری بیزاریت دور کرنے

کا سامان اس نے کر دیا ہے۔ چلتا ہوں میں۔ خدا حافظ۔"، وہ ایک آخری افسوس بھری نگاہ ان کے جھکے چہرے پر ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اندر کی سمت بڑھ گئے تھے۔ لاؤنج کے داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے پکار لگائی تھی۔

"گلناز، مہناز، تہمینہ۔۔۔ تینوں باہر آؤ۔ میں گاڑی میں بیٹھ رہا ہوں۔"، کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھے تھے جہاں سے اسی لمحے گل شیر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ تقریباً بائیس تیئیس سال کا نہایت پرکشش سا نوجوان تھا۔ لمبے کاٹھ قد والا، پٹھانوں جیسی سپید و سرخ رنگت والا۔ اس کی سرمئی آنکھیں بالکل سنجیدہ تھیں۔ ان میں عجیب سی سختی نظر آتی تھی۔ گلابی ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ چہرہ سپاٹ سا دکھتا تھا۔ سادہ سے کریم رنگ کے شلوار قمیض پہنے، وہ اندر ہی آرہا تھا جب جلال صاحب کو دیکھ کر ٹھہرا تھا۔

"باہر ہی چلو، گل شیر۔ وہ تینوں بھی آ ہی رہی ہیں۔ اور ہاں، تیمور سے بھی کہہ دو کہ گاڑی میں بیٹھ جائے جا کر۔ ڈرائیو تم کرو گے۔"، وہ کہتے ہوئے دروازے میں غائب ہو گئے تھے۔ گل شیر نے بھی ایک آخری افسوس بھری نظر یونہی سر جھکا کر بیٹھے زاویار چچا پر ڈالی تھی اور تلخی سے سر

جھٹکتا باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

شام نے اپنے پر اچھے خاصے پھیلا دیئے تھے۔ ہر سو ایک نیم جامنی سی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ وہ نجانے کتنی دیر سے یونہی سڑکوں پر بھٹک رہی تھی۔ آنسو تھے کہ بہہ بہہ کر بھی نہیں تھمے تھے۔ وہ رو رو کر تھک گئی تھی مگر آنکھیں آنسو بہا بہا کر اب بھی نہیں تھکی تھیں۔ بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ وہ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

جس جگہ وہ موجود تھی، وہ گلی قدرے سنسان تھی۔ آس پاس بڑے گھنے درختوں کی قطاریں تھیں، جن کے پیچھے ہی گھر بھی بنے ہوئے تھے۔ کافی فاصلے فاصلے سے اسٹریٹ لائٹز کے پولز لگے تھے جن کی مدھم سی روشنی سے پوری گلی جامنی سے اندھیرے میں بھی سلور روشنی سے نیم روشن ہو رہی تھی۔ اس کا نقاب مکمل طور پر آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی سرخ سی ہو رہی تھیں۔

بستہ کاندھے سے لٹکائے، وہ اس بات سے بالکل بے نیاز ہوئی ہوئی تھی کہ اس کے بستے میں بہت سے قیمتی زیورات اور رقم موجود ہے۔ جبھی کہیں آس پاس سے ہی کسی موبائل کی چنگھاڑ سنائی دی تو وہ جیسے یکدم ہی اپنے ہوش میں آئی۔ اگلے ہی پل اس نے اپنے قدم روکے تھے اور بیگ کاندھے سے اتار کر تیر کی سی تیزی سے بیگ کی زپ کھولی تھی۔ اس کو سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ اسے تو اتنی دیر سے بیگ اور اس میں پڑی اشیاء کا دھیان بھی نہ تھا۔۔ مگر ابھی اس وقت تمام اشیاء بیگ میں صحیح سلامت پڑی دیکھ کر اسے ایک اطمینان سا ہوا تھا۔ بھرے پڑے بیگ میں ہی سامان کے بیچ میں پڑا فون چنگھاڑ رہا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر فون تھاما تھا اور بیگ کی زپ بند کر کے پھر سے کاندھے پر لٹکا کر فرصت سے اسکرین دیکھی تھی۔ اسکرین پر لکھا نام دیکھ کر چند پل ٹھہرنے کے بعد اس نے سبز بٹن پر کلک کر کے فون کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو"، بہت ہی محتاط سے انداز میں اگلی جانب سے فاطمہ کی آواز گونجی تھی۔ ایمان نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

"السلام علیکم۔"، اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے سپاٹ سے انداز میں کہا تھا۔ اگلی جانب اپنے کمرے میں بیٹھی فاطمہ نے بھی ایک سکھ کا سانس لیا تھا۔ اسے صبح والے واقعے کے بعد سے ایمان کی بہت فکر لگی ہوئی تھی۔ نہ اس کا کوئی خیریت کا میسج آیا تھا نہ کال۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسی ہو، آپی؟"، فاطمہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔ وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکتی، لب دبائے اپنے لہجے کی لڑکھڑاہٹ پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایمان نے بے ساختہ ہی اپنی خالی ویران نگاہیں اٹھا کر دور تک سنسان پڑی گلی کو دیکھا تھا۔ کیسی تھی وہ؟

اس نے سوچنے کی کوشش کی تھی اور جواب صاف واضح سا یہ آیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی متورم سرخ آنکھوں میں ایک حزن سا آٹھہرا تھا۔ کسی نے زوروں سے دل کو مٹھی میں دبوچ کر بری طرح روند ڈالا تھا۔

"ٹھیک نہیں ہوں میں، فاطمہ۔"، جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں گھلی نمی کو فاطمہ نے اتنی دور بیٹھ کر بھی صاف محسوس کیا تھا۔ وہ فوراً ہی سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں پریشانی در آئی

تھی۔

"تم کراچی پہنچ گئی ناں، آپی؟"، اس نے بے اختیار ہی پوچھا تھا۔

"ہوں۔۔۔ بالکل خیریت سے پہنچ گئی ہوں۔"، اس کے لہجے میں عجیب بے بسی اور اذیت جھلک رہی تھی۔ فاطمہ کو بے ساختہ ہی کچھ غلط ہونے کا اندیشہ پتا نہیں کیوں ہوا تھا۔

"کچھ ہوا ہے کیا، آپی؟"، ایمان اس کے سوال پر تلخی سے ہنس دی تھی اور ڈبڈبائی آنکھیں سیدھ میں رکھتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔

"زرار بھائی نے بالکل اچھا نہیں کیا، فاطمہ۔ انہوں نے گھر بیچ دیا ہے۔"، اس نے کس اذیت اور تکلیف سے یہ جملہ ادا کیا تھا، یہ بس وہی جانتی تھی۔ چہرے کا ایک ایک حصّہ دہک رہا تھا۔ آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔ فاطمہ تو گویا سکتے میں ہی آ گئی تھی۔ ساکت و جامد سی پلنگ پر بیٹھی رہ گئی تھی۔

"ک۔۔۔ کیا۔۔۔ کہہ رہی۔۔۔ ہو؟"، بمشکل اس نے پوچھا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ حیرت اور بے یقینی در آئی تھی۔

www.novelsclubb.com

"صحیح کہہ رہی ہوں۔"، اس نے تلخی سے کہہ کر سر جھٹکا تھا۔

"تو پھر۔۔۔ تم کہاں ہوا بھی؟"، یہ سوال بے اختیار ہی زبان سے نکلا تھا۔

"سڑک پر۔"، جواب پہلے سے بھی زیادہ تلخی سے آیا تھا۔ فاطمہ تو ہول کر رہ گئی تھی۔ بھلا دیکھو تو، کیا سگے خونی رشتے بھی اتنے دھوکے باز ہوا کرتے ہیں؟ کیا کوئی اپنی ماں کو بھی دھوکا دے سکتا ہے؟ کیا کوئی اپنی ماں کے ساتھ بھی بے ایمانی کر سکتا ہے؟ وہ کم از کم زرار کو اتنا گرا ہوا تو نہیں سمجھتی تھی۔

مگر ماننا پڑے گا کہ بعض دفعہ لوگ ثابت کر دیتے ہیں کہ ہم انہیں جتنا گرا ہوا سمجھتے ہیں، وہ اس سے کئی زیادہ گرے ہوئے ہوتے ہیں!

"میرے اللہ!"، بے اختیار ہی اس کی زبان سے نکلا تھا۔ ایمان ہنوز قدم آگے ہی بڑھا رہی تھی جب اپنے پیچھے سے آنے والی آواز پر وہ یکدم ہی کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔

"خیریت ہے حسینہ؟"، سامنے ہی تقریباً تیس بتیس سال تک کا ایک آدمی کھڑا، دانت نکوستے ہوئے اسے غلاظت سے دیکھ رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

"کون ہے،ایمان ؟"،فاطمہ نے یقیناً اس کی آواز اور خباثت بھرا انداز سن لیا تھا، جبھی فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ایمان کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ حلق تک سوکھ گیا تھا۔الفاظ گویا حلق کا پھندا بن کر حلق کو دکھانے لگے تھے۔وہ فوراً سے پہلے مڑی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ پاتی،اس آدمی نے اسے یکدم ہی کلائی سے اس بری طرح پکڑا تھا کہ بے اختیار ہی اس کی کراہ نکلی تھی۔

"ایمان۔۔۔ایمان۔۔۔کیا ہوا ہے ؟"،فاطمہ نے کچھ بلند آواز میں پریشانی سے بولا تھا۔اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

ایمان کو اس نے اگلے ہی پل کلائی ہنوز تھامے،زبردست طریقے سے پکڑ کر اپنی جانب اس کا رخ کیا تھا۔ایمان حراساں نظروں سے ٹکر ٹکر اس کا خباثت ٹپکاتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔۔۔میرے اللہ !اب کیا زندگی میں یہ بھی ہونا تھا؟اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔سانس جیسے رک رک کر آنے لگی تھی۔

آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہتے،اس کے درد کو سوا کرنے کے جتن کر رہے تھے۔وہ ساکت و

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

جامد کھڑی تھی۔

"گھر نہیں ہے تو میرے ساتھ چل لو، حسینہ۔"، وہ اپنا ہاتھ اب کے اس کے چہرے کے قریب لانے لگا تھا۔ایمان نے بے ساختہ ہی اپنا چہرہ اس تیزی سے پیچھے کیا تھا کہ اس کی اپنی گردن میں بھی بری طرح جھٹکا آیا تھا۔

"ایمان۔۔۔ایمان۔جواب دو۔۔۔کیا ہوا ہے؟"، اگلی جانب اپنے کمرے میں بیٹھی فاطمہ یکدم ہی حواس باختگی سے کھڑی ہو گئی تھی۔اس کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔یا اللہ! کچھ کر دے، یا اللہ!

"ارے میری حسینہ۔۔۔ڈر کیوں رہی ہے؟"، اس کا لہجہ غلاظت اور خباثت سے مزین تھا۔ آنکھوں میں حرص اور درندگی صاف نظر آ رہی تھی۔

"یا اللہ! یہ نہ کرنا میرے ساتھ۔اب میرے صبر کی ہر حد پار ہو چکی ہے۔۔۔یا اللہ!"، اس کے لب ہلتے جا رہے تھے۔۔بے آواز دعائیں چٹانوں کی سی طاقت اور روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی لیے اس کے لبوں سے آزاد ہوتیں عرش بریں تک جا پہنچی تھیں۔ حکم دے دیا گیا تھا۔

حفاظت پہ معمور فرشتوں نے حکم بجالانے کو لمحوں کے حصّوں میں ہی انتظام کر دیا تھا۔

اسی لمحے داہنے جانب سے گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس چمکی تھیں۔ان دونوں نے ہی بے اختیار اس جانب دیکھا تھا۔سامنے سے ایک گاڑی پوری تیزی سے ان کی جانب چلی آرہی تھی۔ایمان کی آنکھیں بے ساختہ ہی چندھیا گئی تھیں۔اس آدمی نے فوراً سے پہلے اس کی کلائی چھوڑی تھی اور بوکھلا کر اس کو پرے دھکیلتا ہوا پیچھے کی اور بھاگا تھا۔ایمان کچھ قدم لڑکھڑا کر پیچھے ہوئی تھی۔ اسی دم گاڑی ایک خطرناک جھٹکے کے ساتھ رک گئی تھی۔

اور اگلے ہی پل گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے ایک چالیس پینتالیس برس تک کا آدمی نکل کر سرعت سے اس خبیث آدمی کے پیچھے بھاگا تھا جو تیزی سے آگے ہی آگے بھاگتا جا رہا تھا۔ایمان نے بہت ہی دھیرے سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو گاڑی کی ہیڈ لائٹس سن پڑی تھیں اور اسے بیک ڈورز کے دونوں جانب سے دو لڑکیاں نکلتی ہوئی دکھائی دی تھیں۔

وہ خبیث آدمی اب کہیں نہیں تھا۔گاڑی کی تیز روشنی بھی اب کہیں نہیں تھی۔وہاں اب

صرف وہ تھی۔۔۔اور اس کا اللہ تعالی تھا جس نے اسے بچا لیا تھا۔احساس تشکر اور شدّت جذبات سے اس کی آنکھیں بری طرح ڈبڈبا گئی تھیں۔اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔سانس بہت بھاری ہونے لگا تھا۔ سر اس بری طرح چکرایا تھا کہ اگلے ہی پل وہ ڈھیر ہوتی زمین پر گرتی چلی گئی تھی۔فون تو کب کا اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سڑک پر جا گرا تھا۔اب وہ بھی اس سڑک پر گری پڑی تھی۔

(دور کہیں حیدر آباد میں زاویار صاحب کے گھر میں کمرے میں اضطراب اور حواس باختگی سے ٹہلتی فاطمہ اب کے سسک سسک کر منہ پہ ہاتھ رکھے رونے لگی تھی۔ٹانگوں سے جان جیسے ختم ہوتی چلی گئی تھی۔وہ وہیں زمین پر بیٹھتی،منہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے بری طرح رونے لگی تھی۔وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی بہن کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔اتنی بچّی تو وہ بھی نہیں تھی۔)

"ثمرین۔۔۔اسے اٹھاؤ۔"،غزل نے بہت ہی پریشانی اور تفکر سے زمین پر بیٹھی ثمرین سے کہا تھا جو ایمان کا سر دپڑتا چہرہ تھپتھپا رہی تھی۔

"باجی۔۔۔اس کی نبض بہت آہستہ چل رہی ہے۔"، ثمرین نے حواس باختگی سے اس کی نبض

چیک کرنے کے بعد غزل سے کہا تو غزل بھی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں شدید پریشانی جھلکتی تھی۔

"بہادر بھائی۔ اسے اٹھانے میں ہماری مدد کیجیے۔"، تبھی غزل نے چہرہ اٹھا کر پھولے تنفس کے ساتھ ان کے ہی قریب آتے ڈرائیور کو مخاطب کیا تھا۔ وہ تیزی سے سر ہلاتا ان تک آیا تھا اور جھک کر ثمرین کے ساتھ ہی ایمان کو سہارا دے کر اٹھایا تھا اور گاڑی کی جانب بڑھ گیا تھا۔ غزل نے ایک نظر زمین پر خود سے کچھ ہی فاصلے پر پڑے فون کو دیکھا تھا اور اگلے ہی پل ہلکا سا جھکتے ہوئے فون اٹھا لیا تھا۔

"وہ ملون بھاگ گیا، باجی۔"، وہ اشتعال دبائے گاڑی تک پہنچ کر ایمان کو اندر لٹاتے ہوئے بولا تھا۔ اندر ارحم بھی پریشانی سے نیند سے اٹھ بیٹھا تھا اور تفکر سے ماں اور اپنی بی بی کو دیکھ رہا تھا جو اب بہادر بھائی کے ساتھ ہی آگے پیسنجر سیٹ پر بیٹھ رہی تھی۔ اس کی مما اس کے ساتھ ہی آ بیٹھی تھیں۔ ارحم نے پریشانی سے اپنے برابر میں بے ہوش پڑی لڑکی کو دیکھا تھا جو اس کے لیے قطعی غیر شناسا تھی۔

www.novelsclubb.com

"یہ کون ہیں، مما؟"، اس نے بلا کی معصومیت سے حیرت کے ساتھ غزل کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپی ہیں، بیٹا۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔"، غزل نے پریشانی سے اپنے سامنے بے ہوش پڑی لڑکی کو دیکھ کر بیٹے کو جواب دیا تھا۔ پتا نہیں کون تھی یہ؟

("میرے اللہ۔"، فاطمہ منہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ دروازہ اندر سے لاک تھا اور باقی سب بھی اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ایسے میں اس کی دبی دبی سسکیوں کی آواز اگر باہر جا بھی رہی تھی تو سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ غیر ہوتی حالت اور دکھتے گلے کے ساتھ منہ ہاتھوں میں چھپائے سسک رہی تھی۔

"یہ کیا ہوا ہے، میرے اللہ؟ میری بہن پر رحم کر، میرے مالک!"، اس کو اپنا دماغ گویا ماؤف ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ سانسیں تھمتی محسوس ہو رہی تھیں۔ چہرہ پوری طرح سے بھیگا ہوا تھا۔)

"یہ بے ہوش ہیں؟"، ارحم کا ایک اور معصومانہ سوال ابھرا تو غزل نے اس کا سر اپنے سینے سے

لگاتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔ گاڑی تیزی سے مین روڈ پر رواں تھی۔ شام کا اندھیرا رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ گاڑی بھی اس تاریکی کو چیرتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

بارش کے قطرے ایک تواتر کے ساتھ زمین بوس ہوتے لندن کی سڑکوں کو بری طرح سے بھگو رہے تھے۔ آس پاس بہت ہی کم، اکا دکا لوگ ادھر ادھر جاتے دکھائی دیتے تھے۔ آج ان سب نے ہی اپنے سروں پر چھاتے تان رکھے تھے۔ لندن کی عوام یوں تو ویسے بھی تیز بارشوں کی عادی تھی، مگر آج کی بارش کچھ زیادہ ہی طوفانی ثابت ہو رہی تھی۔ بارش نے ہر شے پر دھند چڑھا دی تھی۔ محسوس ہوتا تھا گویا ہر شے کسی دھندلے آئینے کے پار سے نظر آ رہی ہو۔

ایسے میں ایک سڑک کے دائیں جانب بنے ایک کیفے کے ریسیپشن ڈیسک پر کوئی لڑکا کھڑا، کھٹا کھٹ کی بورڈ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ تین چار مزید کیز پریس کر کے اس نے بل نکال کر اپنے

سامنے کھڑی لڑکی کی جانب بڑھایا اور ساتھ ہی متوازن گھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"چالیس پاؤنڈز، میم۔"، اس نے نہایت شائستگی سے کہا تھا۔ لڑکی اس کی بات سن کر سر ہلاتی پرس میں سے پیسے نکالنے لگی تھی۔ وہ منتظر سا لڑکی کو دیکھ رہا تھا جب اچانک ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا تھا۔ سر یکدم ہی بری طرح چکرایا تو اس نے بے اختیار ہی ریسیپشن ڈیسک تھام کر خود کو سنبھالا۔ اچانک ہی شدید متلی سی ہوئی تھی۔

"ہیئے۔"، اس لڑکی کے مخاطب کرنے پر اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا جو پیسے اس کی جانب بڑھائے کچھ الجھن سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً سے ہاتھ آگے بڑھا کر پیسے اس کے ہاتھ سے تھامے اور بمشکل خود کو حاضر دماغ رکھتے ہوئے دراز کھول کر اس میں ترتیب سے پیسے ڈالے۔ وہ لڑکی ویسے ہی کھڑی اسے جانچتی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ اس کی سبز چمکتی آنکھوں میں تشویش اور تفکر ابھرا تھا۔

"آر یو فائن؟"، خالص برطانوی لہجے میں اس گھنگریالے بالوں والی لڑکی نے پوچھا تو اس نے سر اثبات میں ہلایا اور اگلے ہی پل باقی کے بچے ہوئے پیسے اس کی جانب بڑھا دیئے جو اس لڑکی نے

بھی فوراً سے تھام لیے۔ البتہ اس کی آنکھیں اب بھی متفکر دکھتی تھیں۔

"آر یو شیور ڈیٹ یو آر فائن؟"

"یس۔"، یک لفظی جواب اس کو تھما کر وہ اگلے ہی پل مڑا تھا اور قدم تیزی سے اندر کی جانب بڑھائے تھے۔ پیچھے وہ لڑکی متفکر سے انداز میں ایک آخری نظر اس پر ڈال کر باہر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

اندرونی پردے ایک طرف کو سرکاتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تھا جس پر سامنے ہی اوون کے پاس کھڑے سرخ بالوں والے لڑکے نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر تاثرات ہی کچھ ایسے تھے کہ وہ لڑکا تفکر سے اس کی جانب بڑھ آیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو، رضا؟"، اس نے شستہ امریکی لہجے میں اس سے پوچھا تو رضا نے اپنی سرخ پڑتی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور ان آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ لڑکا وہیں رک سا گیا۔

"ک۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟"، وہ پریشان ہوا تھا اور یہ پریشانی اس کے چہرے سے صاف جھلک رہی تھی۔ رضا نے ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر سر نفی میں ہلاتا ہوا آگے بڑھ کر ایک کرسی

کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔اگلے ہی پل سر پیچھے کو گرا کر اس نے دو انگلیوں سے بے اختیار ہی اپنی پیشانی دبائی تھی۔

"باہر کون ہے ؟"، سرخ و سپید سی رنگت والے لڑکے نے اب کی بار پوچھا تو رضا نے ہنوز ویسے ہی سر گرائے، آنکھیں تھوڑی سی کھول کر اس کو دیکھا۔

"کوئی نہیں ہے۔ تم چلے جاؤ۔"، اس نے خاصی برہمی سے جواب دیا تھا جس پر اس لڑکے نے بے ساختہ ہی لب بھینچے تھے۔ پھر مٹھی بھینچ کر ایک قدم اس کے قریب آیا تھا۔

"یو نو واٹ ؟ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے تمیز سے بات کی جائے۔"، وہ اس سے بھی زیادہ بد تمیزی سے کہتا ہوا سر جھٹک کر باہر چلا گیا تھا۔رضا نے آنکھیں ایک بار پھر موند کر پیشانی دبائی تھی۔اس کے سر میں نجانے کیوں اچانک سے اتنی شدید درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پھر سر سیدھا کر کے اس نے دونوں ہاتھوں کو کھول کر ہتھیلیوں سے پورا سر ہر جانب سے دبایا تھا۔

اچانک ہی آنکھوں کے پردوں پر کسی کا سایہ سالہرایا تھا۔ کسی سیاہ آنکھوں والی کا۔ کسی سیاہ بالوں والی کا۔ کسی اپنی اپنی سی لڑکی کا۔ کسی بہت قریبی شخص کا۔اور وہ یکدم ہی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ وہ

جب سے یہاں آیا تھا، اس کی روحان سے بس ایک بار ہی بات ہوئی تھی۔ اور وہ بھی بس اسی دن جس دن وہ یہاں پہنچا تھا۔ اپنی خیریت کا بتانے کے لیے اس نے تب اسے فون کیا تھا۔ اور تب بھی ایمان کے بارے میں کوئی خاص بات وغیرہ نہیں ہوئی تھی۔

نجانے کیوں اس کے دل میں ایک فکر نے سر اٹھایا تھا۔ کچھ تو تھا جو کھٹک رہا تھا۔ یا نجانے کچھ تو تھا جو محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً سے اٹھ کر قدم دروازے کے ساتھ لگے کوٹ اسٹینڈ کی جانب بڑھائے تھے اور اس پر لٹکے کوٹوں میں سے ایک بھورے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اندر سے موبائل نکال کر اس نے اگلے ہی پل روحان کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اگلی جانب بیل جاتی جا رہی تھی۔

کافی دیر تک بیل جاتی گئی تھی مگر کسی نے فون نہ اٹھایا تھا۔ اب کے اس کی پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ وہ پریشانی سے یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں ٹہلتا، فون مسلسل کان سے لگائے، لب دبائے، کال اٹھائے جانے کا منتظر تھا۔ مگر اگلی جانب سے کوئی جواب تو دور کی بات، کال بھی پک نہیں کی جا رہی تھی۔

جبھی اس کے ذہن میں یکدم ہی ایک نام لپکا تو اس نے فوراً سے ایک دوسرا نمبر ڈائل کر فون کان سے لگایا۔اگلی جانب سے چند ہی گھنٹیوں کے بعد کال اٹھالی گئی تھی۔

"ہیلو رضا بھائی۔"،حسنہ کی متورم آواز اگلی جانب سے ابھری تھی۔وہ یکدم ہی سیدھا ہو گیا تھا۔ ٹانگیں جیسے مزید حرکت کرنے سے انکاری ہو گئی تھیں۔

"ہ۔۔۔ہیلو حسنہ۔روحان کہاں ہے؟"،اس نے بہت ہی مشکلوں سے پوچھا تھا۔آنکھوں میں نجانے کہاں سے ڈھیر ساری نمی امڈ آئی تھی۔دل کی دھڑکنوں نے عجیب لے پر رفتار پکڑی تھی۔

"پتا نہیں بھائی۔وہ کل رات سے گھر نہیں آیا ہے۔میری گاڑی لے کر ایمان کو چھوڑنے گیا تھا بس اڈّے تک۔اس کے بعد سے اس کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔نہ فون لگ رہا ہے اور نہ وہ خود کوئی رابطہ کر رہا ہے۔"،وہ جیسے اگلی جانب سے بھری بیٹھی تھی۔یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔رضا کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو کر ایک نقطے پر ٹھہر سی گئی تھیں۔

اس کا ہاتھ پہلو میں آگرا تھا۔فون کو تھامے ہاتھ میں بھی لرزش سی تھی۔اس لمحے سب کچھ اپنے

ہاتھوں سے پھسلتا محسوس ہوا تھا۔یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ خالی ہاتھ کسی سڑک پر کھڑا رہ گیا ہو۔ جیسے نہ اس کے پاس کوئی ٹھکانہ ہو نہ کوئی آسرا۔نہ اس کے پاس ایمان زاویار کا ٹھکانہ تھا اور نہ ہی روحان یا مین کا آسرا۔

الفاظ نہین بن پڑ رہے تھے۔ جبکہ حسنہ اگلی جانب سے اب بھی کہے جا رہی تھی۔

"وہ نجانے کہاں رہ گیا ہے، بھائی۔امی اور خالہ ابھی فی الحال قدسیہ خالہ کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔ رانیہ سے بھی نجانے کیا کچھ کہہ کر بات چھپا رکھی ہے۔۔۔مگر اب میری سمجھ سے باہر ہو رہا ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ کیسے تلاشوں اسے؟"، وہ رونے کے درمیان ہچکیوں سے کہہ رہی تھی۔ رضا کو اپنے آس پاس دھماکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ سر گویا چکرا کر رہ گیا تھا۔

اس کی دھڑکنوں کی رفتار بھی خطرناک حد تک تیز ہو رہی تھی۔ چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔اس نے بے اختیار ہی گھٹن کے مارے اپنی چاکلیٹی رنگ کی ٹی شرٹ کے اوپری دو بٹن کھولے تھے۔اور پھر سر پر سے بھوری پی کیپ اٹھا کر سامنے پچھلی میز پر پھینکی تھی۔ فون بھی اس نے میز پر ہی پٹخنے

کے سے انداز میں رکھا تھا۔اسی لمحہ وہ سرخ بالوں والا لڑکا پھر سے پردے سر کا کر اندر داخل ہوا تھا۔

"اے لڑکے۔پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"،اس کے الفاظ میں تو برہمی تھی مگر لہجے میں کہیں تفکر جھلک رہا تھا۔وہ پریشانی سے چلتا ہوا اس تک آیا تھا اور وہ جوڑھے جانے کے سے انداز میں کھڑا تھا،اسے یکدم ہی شانوں سے تھاما تھا۔

"کیا ہوا ہے؟ بتاؤ مجھے۔"

رضا نے بے بسی بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا اور اگلے ہی پل اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔وہ وہیں زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔وہ لڑکا بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔رضا کی شہد رنگ آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہہ کر اس کی رخساروں کو بھگونے لگے تھے۔

"کیا ہوا ہے،رضا؟ کچھ تو بکو۔"،وہ پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔رضا کی غیر ہوتی حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"آئی نیڈ ٹو گو، کائی۔"، نہایت پھنسی پھنسی سی ایک آواز اس کے حلق سے بر آمد ہوئی تو وہ پہلی فرصت میں اٹھ کر کوٹ اسٹینڈ کی جانب گیا اور وہاں سے اس کا کوٹ اتار کر اس تک لایا اور وہیں اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

"پہنو اسے۔ اور ریلیکس کرو۔ میں سر سے بات کر لوں گا۔ ڈونٹ وری۔ گھر جا کر ریسٹ کرو۔ گڈ بوائے۔"، نہایت مستعدی سے اس سے کہتا ہوا کائی بالکل کوئی بڑا سمجھدار سا بھائی لگ رہا تھا اور رضا کوئی چھوٹا، شکست خوردہ سا بچّہ۔ اس نے اس کے شانے تھپتھپا کر اسے پکڑ کر کھڑا کیا تھا اور اس کے ہاتھ میں کوٹ تھمایا تھا۔ پھر چلتا ہوا میز کی اگلی جانب گیا اور بازو لمبا کر کے ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کی پی کیپ اٹھائی۔ پھر چلتا ہوا واپس سے اس تک آیا۔

"اوہو۔ اب اتنے بھی بے بی نہیں ہو تم۔ اپنا کوٹ تو خود پہننا سیکھ لو بھئی۔"، وہ مصنوعی خفگی سے اسے ڈپٹتا ہوا بولا اور اسے کوٹ پہنانے میں مدد کی۔ رضا مرے مرے ہاتھوں اور بازوؤں کو ہلاتا جلاتا کوٹ پہن کھڑا ہوا تو کائی نرمی سے ہلکا سا مسکرایا۔ پھر اس کی سیاہ چھتری اسٹینڈ کے پیچھے سے اٹھا کر لایا اور اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

"ویسے ابھی تمہارا دوسرا ہی دن ہے۔اگر تمہارے ماموں کی سفارش نہ ہوتی تو تمہیں اتنی جلدی تو یہاں ہرگز جاب نہ ملتی۔اب مل ہی گئی ہے تو قدر کرنا سیکھو۔ سمجھے؟ کل طبیعت ٹھیک کر کے آنا، ہوں؟" وہ بہت نرمی سے اس سے بول رہا تھا اور رضا تھکی تھکی سرخ متورم آنکھیں لیے سر ہلکا سا اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔کائی سے اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا گیا تھا۔اس نے بے اختیار ہی نگاہیں چرائی تھیں۔

"گو اینڈ ریلیکس، اوکے؟"، وہ بہت ہی نرمی سے کہہ رہا تھا اور رضا اس عجیب و غیرب کیفیت میں بھی کچھ حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔وہ کہیں سے بھی کچھ دیر پہلے تک والا کائی نہیں لگ رہا تھا جو اس کو ہر کچھ لمحوں میں ایک گھوری سے نواز رہا تھا اور بات بات پہ اسے ذلیل کروانے کے مواقع ڈھونڈ رہا تھا۔

"ناؤ گو۔"، اس کا شانہ ہلکے سے تھپک کر وہ نرمی سے مسکرا کر اوون کی جانب پلٹ گیا تھا۔ایک آخری نظر اسے دیکھ کر رضا نے مرے مرے سے قدم باہر کی جانب بڑھائے تھے۔اس کا دماغ اب تک ماؤف ہو رہا تھا۔آنسو البتہ اب رک چکے تھے۔ مگر آنکھیں صاف صاف رونے کی چغلی

کھا رہی تھیں۔ کوئی بھی دیکھتا تو یہ اندازہ لگانے میں ایک لمحہ بھی نہ لگاتا کہ وہ رو کے آ رہا ہے۔

"اس کو چھوڑ دے، رضا۔ اس کو اپنی یادوں کے جال میں پھنسنے نہ دے۔ وہ نئی زندگی کی شروعات کر رہی ہے۔ اس کو کرنے دے۔"

روحان یا مین کی آواز کہیں آس پاس سے ہی گونجی تھی۔ کیا رضا نے روحان کو ایمان کی حفاظت کی ذمّے داری سونپ کر کچھ غلط کر دیا تھا؟ اگر روحان کو کچھ ہو گیا تو وہ کیسے اپنے آپ کو معاف کرے گا؟ جبھی اس کے ذہن میں یکدم ہی کچھ بہت بری طرح سے کھٹکا تھا۔

سڑک پر آگے ہی آگے بڑھتے اس کے قدم یکدم ہی تھمے تھے۔ سیاہ چھتری تھامے ہاتھ بری طرح سے کپکپائے تھے۔ اگر روحان کہیں نہیں ہے تو ایمان کہاں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان دونوں کا جاتے وقت کوئی ایکسیڈینٹ وغیرہ ہو گیا ہو۔ کہیں ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ اور اس خیال پر ارتضی مراد کو اپنی جان فنا ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

کوئی قطرہ قطرہ اس کی روح کو سینچ رہا تھا۔ وہ نوجوان سالڑ کا دور پردیس میں کسی انجانے خوف

www.novelsclubb.com

سے، کسی انجانے ڈر سے بری طرح دہل کر رہ گیا تھا۔ اگر ایسا ویسا ہی کچھ ہو گیا ہوا تو؟ اگر روحان اور ایمان کو کچھ ہو گیا ہوا تو؟ اگر اس کی متاع حیات ایک جھٹکے میں خاک میں مل گئی تو؟

تو کیا تب ارتضیٰ مراد زندہ رہ پائے گا؟

کیا وہ سکون سے مر پائے گا؟

کیا وہ جیتے جی مر نہ جائے گا؟

بارش نجانے کب تھمتی چلی گئی تھی۔ اسے پتا نہ چل سکا تھا۔ وہ بس یونہی خالی ویران آنکھوں سے اپنے خالی ہاتھ کو دیکھنے لگا تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ سرمئی آسمان خود بخود صاف ہونے لگا تھا۔ مگر اب کہ جو ہوائیں چل رہی تھیں، وہ اچھی خاصی تیز طوفانی ہوائیں تھیں۔

ارتضیٰ مراد یونہی ویران سا سڑک کے کنارے پر کھڑا رہ گیا تھا۔

"موو فارورڈ۔"، جبھی پیچھے سے ایک فربہہ مائل عورت نے نخوت سے کہا تو وہ جو ٹھہرا ہوا تھا، سر جھکا کر آگے چل پڑا۔ اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ چہرے کی رنگت تبدیل ہوئی

ہوئی تھی۔اس کا ہر ہر انداز صاف بتلاتا تھا کہ یہ انسان شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ مگر وہاں اس کی جانب دھیان دینے والا تھا ہی کون ؟لندن کی مصروف سی سڑکیں اور اس کے جیسے ہی مصروف سے لوگوں کو کہاں فرصت تھی اس ایک ٹوٹے ہوئے شخص کو دیکھنے کی یا اس کی جانب دھیان دینے کی؟

زندگی کو اداس کر بھی گیا

وہ کہ موسم تھا ایک گزر بھی گیا

www.novelsclubb.com

سارے ہمدرد بچھڑے جاتے ہیں

دل کو روتے ہی تھے جگر بھی گیا

خیر منزل تو ہم کو کیا ملتی

شوق منزل میں ہمسفر بھی گیا

موت سے ہار مان لی

آخر چھرۂ زندگی اتر بھی گیا

جاری ہے!

www.novelsclubb.com

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP: